سرودِ رفتہ

ترتیب و تحشیہ

غلام رسول مہر

صادق علی دلاوری

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

کشمیری بازار لاہور | اردو بازار لاہور | بندر روڈ کراچی

سرودِ رفته

سرودِ رفتہ

یعنی

حضرت علّامہ اقبالؒ کا وہ کلام جو اُن کے
ترتیب دیے ہُوئے کسی مجمُوعے میں شامل نہ ہُوا
اور اب اسے تبرّک کی حیثیّت حاصل ہے۔

ترتیب و تحشیہ

غلام رسُول مہر
صادق علی دلاوری

کتاب منزل، پوسٹ بکس ۵۲۸، لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۲۵

بار اول سنہ ۱۹۵۹ء

Rs

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے
علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے
طبع کرا کے کتاب منزل کشمیری بازار
لاہور سے شائع کیا۔

فہرست مطالب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اقبالؒ نے "بانگِ درا" مرتب فرماتے وقت اپنے اردو کلام کا خاصا بڑا حصہ قلم انداز کر دیا تھا۔ اس طرح ان کی بہت سی نظمیں اور دوسرے اشعار عام شائقین کی دسترس سے باہر نکل گئے، جنھیں ان کی سخن گوئی کے اوائل میں ملک کے مختلف رسالے بڑے فخر سے چھاپتے تھے اور "مخزن" کے لیے تو سب سے زیادہ گراں قدر سرمایہ انھیں کا کلام تھا۔ پھر متروکہ نظموں میں سے متعدد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئی تھیں، جن کی عظمت و شان پاک و ہند کے ہر حصے سے اصحابِ علم و فضل کو کھینچ لاتی تھی اور بے خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آج سے پچاس پچپن سال پیشتر تک ایسے اجتماعات اس وسیع سرزمین میں بہت کم ہوتے تھے۔

انھیں نظموں سے مرحوم کی عالمگیر شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ کلام خود ان کے نزدیک بھی ایک زمانے میں قابلِ قدر ہی ہوگا، ورنہ اسے چھپنے کے لیے کیوں دیتے یا انجمن کے جلسوں میں کیوں پڑھتے؟

ابتدا ہی سے اقبالؒ کا دستور یہ تھا کہ انجمن میں پڑھنے کے لیے جو نظم لکھتے تھے، اسے چھپوا لیتے تھے۔ نظموں کی چھپی ہوئی کاپیاں قدردان اصحاب جلسے ہی میں خاصی بڑی رقمیں دے کر خرید لیتے تھے۔ اس طرح انجمن کو معقول رقم ان مطبوعہ نظموں سے بھی مل جاتی تھی۔ عام چندہ ان کے علاوہ تھا۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات کا ذکر انجمن کی رپورٹوں میں بھی جا بجا ملتا ہے اور خود اقبالؒ کی ایک نظم میں بھی ایسے اشارے موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظمیں پڑھنے سے پیشتر چھپوا لیتے تھے۔

میرے علم کی حد تک صرف ایک نظم ہے، جو پڑھنے سے پیشتر طبع نہیں کرائی گئی تھی اور وہ "شکوہ" ہے۔ جس سال "شکوہ" پڑھا گیا، انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں ہوا تھا۔ ہوسٹل کے دروازے میں کھڑے ہوں تو صحن کے دائیں جانب آخری حصے میں سٹیج آراستہ کی گئی تھی۔ اقبالؒ نے انجمن کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے کی ابتدا سنہ ۱۹۰۰ء میں کی اور سب سے پہلے "نالۂ یتیم" پڑھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" سنہ ۱۹۰۲ء میں "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے" سنہ ۱۹۰۳ء میں "ابرِ گہربار" جو "فریادِ امت" کے نام سے معروف ہوئی اور سنہ ۱۹۰۴ء میں "تصویرِ درد" جس کا پہلا شعر یہ ہے:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

سنہ ۱۹۰۵ء میں کوئی نظم نہ پڑھی اور اسی سال اگست میں وہ ولایت چلے گئے، جہاں تین سال گزار کر سنہ ۱۹۰۸ء میں آئے۔ واپس آکر بھی انھوں نے تین سال تک کوئی نظم نہ پڑھی۔ گویا "تصویرِ درد" کے بعد جو پہلی نظم انجمن کے جلسے میں سنائی وہ "شکوہ" تھی۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں اسے سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان کی پہلی نظمیں بھی ندرتِ ترتیب و افکار، یگانگی تاثیر و نفوذ اور حسنِ بیان و کشش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتی تھیں، لیکن "شکوہ" اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری نظم تھی۔ نہ اس کی کوئی مثال پہلے موجود تھی۔ نہ بعد میں مہیا ہو سکی۔

غور فرمائیے جب آپ سنیں گے کہ کوئی شاعر خدا کی بارگاہ میں امت کی طرف سے شکوہ و شکایت لے کر آیا ہے تو آپ کے ذہن میں نظم کا کیا نقشہ جمے گا؟ یہ کہ امت نے دین کی خدمت میں فلاں فلاں کارنامے انجام دیے مگر ان کا صلہ یہ ملا کہ امت درجہ بہ درجہ تنزل پذیر ہوتی رہی یہاں تک کہ انتہائی پستی میں پہنچ گئی۔ اس سے پیشتر خواجہ حالی مرحوم "شکوۂ ہند" لکھ چکے تھے جس میں اپنی تباہی، اپنے ابتدائی اوصافِ حسنہ کی بربادی اور گریہ و ماتم کے سوا کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظمیں سن کر قوم کے عزم و ہمت

اور جوش و سرگرمی پر افسردگی ہی طاری ہو سکتی تھی، لیکن اقبالؔ کا "شکوہ" ملاحظہ فرمائیے اس کا ہر بند امت کے ان عظیم الشان کارناموں کا داستاں سرا ہے، جن سے گراں بہا تر کارنامے تاریخ کے صفحات پر ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے تاہم انھیں ایسے انداز میں آراستہ کیا گیا ہے کہ شکوے کا حق بھی ادا ہوتا جا رہا ہے اور سامع کے دل پر افسردگی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی بلکہ اس کا عزم زیادہ سے زیادہ مستحکم، اس کی ہمت زیادہ سے زیادہ بلند، اس کا جوش عمل زیادہ سے زیادہ بے پناہ صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مثلاً:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا، اس کو کیا سَر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں!

دیکھیے ہر بند شکوے پر مبنی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ مُسلمان کی حقیقی شان کیا ہے، اس کائنات میں اس کے وظائف کیا ہیں، مجمع انسانیت میں ملّتِ بیضا کا مقام کیا ہے، قرآن مجید میں اسے اُمَّۃً وَسَطاً لِتَکُونُوا شُہَدَاءَ عَلَی النَّاسِ قرار دیا تو کیوں قرار دیا، پھر وہی پہلو منتخب کیے، جو جماعتی اور قومی زندگی میں حقیقی اسلامی پہلو تھے اور جن کی برکت سے اسلافِ کرام نے تاریخ انسانیت میں بلند ترین مرتبہ حاصل کیا۔ مثلاً:

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہُوئی؟ اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہُوئی
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہُوئی؟ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہُوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
مُنہ کے بل گر کے ہُوَاللّٰہُ اَحَد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز، قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہُوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے اور معلُوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

جب مسلمانوں کی پریشاں حالی کا ذکر فرماتے ہیں تو دیکھیے کیا انداز اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صرف مسلمان ہی گنہگار نہیں

دُوسری قومیں بھی گنہگاری کے داغوں سے پاک نہیں۔ ان میں عاجز بھی ہیں اور مغرور و متکبر بھی کاہل بھی ہیں اور غافل بھی۔ ایسے بھی ہیں جو خدا کے نام تک سے بیزار ہیں لیکن ان سب پر رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے اور بجلی صرف مسلمانوں پر گرتی ہے۔

پھر اپنی زبان سے نہیں بُتوں کی زبان حال کے ترجمان بن کر فرماتے ہیں،

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مُسلمان گئے — ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اُونٹوں کے حُدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؛

اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ نظم ہر اعتبار سے نرالی اور یگانہ تھی، آغاز و انجام کے بعض بند چھوڑ کر جن میں دُوسرے مطالب ہیں، اس نظم کا ہر بند بہ یک وقت شکوہ بھی ہے، اسلامی کارناموں کا داستان سرا بھی اور حقیقی اسلامی شیون کی جانب پُرتاثیر دعوت بھی۔ ایسی معجز نما شاعری کی مثالیں کہاں ملیں گی؛

ہزاروں آدمی اسے سُننے کے لیے آئے تھے۔ اقبالؒ نے پہلے ایک قطعہ سنایا جس کا آخری شعر یہ تھا:

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی

اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

پھر نظم سنانے لگے تو حاضرین نے اصرار کیا کہ ترنّم سے سنائی جائے، جیسا کہ وہ ابتدا سے اپنی تمام نظمیں ترنّم سے سناتے رہے تھے اور "شکوہ" کے بعد "شمع اور شاعر" "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" ترنّم ہی سے سُنائی گئی تھیں۔ اقبالؒ نے فرمایا: صرف میں جانتا ہُوں نظم پڑھنے کا کون سا طریقہ موزوں ہے۔ یہ نظم ترنّم سے نہیں پڑھی جاسکتی۔ چنانچہ تحت اللفظ ہی پڑھی اور انداز اس درجہ

دِل آویز تھا کہ جن خوش نصیبوں نے یہ سُنی، وہ زندگی کے آخری لمحے تک اسے نہ بھُولے ہوں گے اور نہ بھولیں گے۔ اس نظم کی کاپی جو اقبالؔ اپنے قلم سے لکھ کر لائے تھے، اس کے لیے متعدد اصحاب نے ایک ایک سو روپے کی رقم پیش کی تھی۔

اس کے بعد "شمع اور شاعر" اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پڑھی گئی، "خضرِ راہ" شیرانوالہ دروازہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں اور "طلوعِ اسلام" بھی اسی جگہ پڑھی تھی۔ "جوابِ شکوہ" موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام میں سُنائی تھی جو محض اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا اور وہ بھی پڑھنے سے پیشتر چھپوا لی گئی تھی۔

بہر حال متروکہ نظموں کے بہت سے اشعار عام لوگوں کی زبانوں پر تھے۔ اس لیے کہ وہ بڑے بڑے مجمعوں میں پڑھی گئی تھیں اور "بانگِ درا" کی اشاعت سے پیشتر کتابچوں کی شکل میں چھپ کر فروخت ہوتی رہی تھیں۔ جو لوگ کلامِ اقبالؔ کے شائق تھے، وہ انھیں کتابچوں پر قناعت کے لیے مجبور تھے یا کسی کو مخزن کے مختلف نمبر یا جلدیں مل جاتی تھیں تو انھیں خرید لیتا تھا۔ کتابچوں میں سے "مرغوب ایجنسی" کی چھاپی ہُوئی نظمیں بہت مقبول ہُوئیں، اس لیے کہ "مرغوب رقم" کا خط بہت اچھا تھا اور نظموں میں کاغذ بہت عمدہ لگایا جاتا تھا۔ ان کتابچوں میں سے "نالۂ یتیم"، "فریادِ اُمّت"، "تصویرِ درد"، "اکبری اقبال" وغیرہ بہت شائع ہوئیں۔ اقبالؔ کی نظموں کے اتباع میں بعض دُوسرے شعرا کی مشہور نظمیں بھی اسی انداز میں چھاپی گئیں۔ مثلاً آغا حشر مرحوم کی نظمیں "شکریۂ یورپ" اور "موجِ زمزم"۔ تلاش کی جائے تو شاید اب بھی بازار میں ان کے کچھ نسخے مل جائیں، خصوصاً پرانی کتابیں اور رسالے فروخت کرنے والوں کے پاس ضرور موجود ہوں گے۔ بعض نظمیں ایسی بھی تھیں، جن کے متعلق خواص کو بھی شاید ہی علم ہو حالانکہ وہ بہت بڑے مجمعوں میں سنائی گئی تھیں، مثلاً "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے" جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۹۰۲ء میں پڑھی گئی تھی یا ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ جو ۱۹۰۱ء کے ایک ماتمی جلسے میں سُنایا گیا تھا۔

اقبالؔ نے ان نظموں کو اوّلاً اس وجہ سے اپنے مستند مجموعہ کلام میں شامل کرنا پسند نہ فرمایا کہ جس زمانے میں "بانگ درا" مرتب ہوئی، شعر و سخن کے باب میں ان کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا اور یہ نظمیں اس معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔ بندش اور اسلوب بیان کے سلسلے میں وہ بڑے ہی سخت تھے مثلاً ایک مرتبہ مولانا گرامی کا یہ شعر بہت پسند آیا:-

ماہ را بر فلک دو نیم کند

فقر را تر کمانیے ہم ہست

اس زمانے میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ قرشیت بھی خلافت کی ایک شرط ہے اور یہ شرط ترکوں میں مفقود ہے۔ اقبالؔ نے مندرجہ بالا شعر سے نہایت عجیب نکتہ پیدا کر لیا۔ فرماتے ہیں:

سخنے راندہ کہ جز قرشی بر سر مسندِ نبیؐ نہ نشست

درس گیر از گرامیِ ہمہ دَرد کہ بریدا ز خود و بہ او پیوست

رمزِ ترک و خلافتِ عربی گفت آں مَیگسارِ بزمِ الست

ماہ را بر فلک دو نیم کند

فقر را تر کمانیے ہم ہست

یہ تضمین اس لیے "پیامِ مشرق" میں شامل نہ کی کہ فرماتے ہیں اس کی بندش کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ جس بزرگ کی نگہ بلند ایسی پاکیزہ نکتہ نوازیوں کو صرف اس لیے ترک کر دیتی تھی کہ بندش زیادہ اچھی نہ تھی، اس نے اگر بہت سی لمبی نظموں کو اپنے مستند مجموعے میں شامل نہ کیا تو اس پر تعجب کی کون سی وجہ ہے؟

دوسرا ضروری عامل جو بہت سی نظموں کے ترک کا موجب بنا یقیناً یہ تھا کہ اقبالؔ صرف انھیں نظموں کو محفوظ رکھنے پر رضامند تھے، جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کائناتِ انسانیت کے لیے مفید ہو سکتی تھیں یعنی جو ان کے خاص پیغام، خاص تعلیم اور حقائقِ حیات

کی حامل تھیں جن کے ذریعے سے انسان اپنے حقیقی وظائف و مقاصد بہتر طریق پر بجا لانے کے اہل بن سکتے تھے۔ جو نظمیں موضوع، فکر و خیال اور ترتیب و ترکیب کے لحاظ سے اس میزان میں پوری نہ اُترتی تھیں، انھیں محفوظ رکھنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ چنانچہ بیشتر نظمیں اور بیشتر اشعار صرف اس لیے خارج کر دیے گئے کہ ان کا دامن بہ حیثیت مجموعی معنویت کے ان جواہر ریزوں سے خالی تھا جن پر اقبال کے نزدیک شعر و سخن کے محاسن کا حقیقی انحصار تھا۔

تاہم یہ سوال "بانگِ درا" کی اشاعت کے وقت ہی سے اہلِ ذوق کی توجہ کا موضوع بنا رہا کہ آیا اقبال کے ان جواہر ریزوں کو بالکل طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا جائے جنھیں خود انھوں نے بندش یا معنویت کے اعتبار سے اپنے بلند معیار کے مطابق نہ سمجھا یا انھیں کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کر دینا چاہیے، تاکہ وہ بھی کلامِ اقبال کے مستند مجموعوں کی طرح محفوظ ہو کر موجودہ و آیندہ نسلوں کی دسترس میں رہیں اور ضائع نہ ہونے پائیں۔ اقبال اس دُنیا سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے تو اس سوال نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی، اس لیے کہ ان نظموں کی فراہمی کے وسایل ناپید نہ ہُوے تھے مگر مزید کچھ مدت گذر جانے کے بعد ان کا جمع ہونا بھی نظر بہ ظاہر محال تھا۔

ایک گروہ کا نقطہ نگاہ کسی تشریح یا استدلال کا محتاج نہ تھا، یعنی یہ کہ جن چیزوں کو خُود اقبال نے محفوظ رکھنا مناسب نہ سمجھا اور قلم زد کر دیا، انھیں کیوں محفوظ کیا جائے؟ کیا اس لیے کہ اقبال کے خاص پیغام اور خاص تعلیم میں ایسی چیزوں کی آمیزش کر دی جائے، جو اس پیغام اور اس تعلیم کی حامل نہ تھیں؟ لیکن اس کا جواب مشکل نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ اقبال بہ ہر حال انسان تھے۔ یقیناً بہت بڑے اور غیر معمولی انسان، لیکن ان کی بڑائی انسان ہوتے ہی کی حیثیت میں قابلِ صد احترام تھی۔ وہ ابتدا میں بھی بعض صلاحیتوں کی یگانگی کے باعث عام لوگوں سے بالا تھے۔ مگر ان صلاحیتوں کے اُبھرنے، نمایاں ہونے اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں وقت لگا۔ جو اعلیٰ مرتبہ انھیں آخری دور میں حاصل ہوا اور اب حاصل ہے، وہ ابتدائی اور درمیانے دور میں ہرگز حاصل نہ تھا۔ ان کی حقیقی عظمت

کا انحصار لاریب اسی کلام پر ہے جسے انھوں نے خود پسند فرمایا اور حفاظت کے لائق سمجھا، لیکن ان کا بقیہ کلام ایسا نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے اس لیے کہ اس میں بھی بعض بڑی بلند پایہ چیزیں موجود ہیں، نیز جو درجہ اقبال کے لیے قدرت نے مقرر کر رکھا تھا، وہ انھیں مل گیا۔ اب کوئی چیز ان کی تعلیم یا ان کی عظمت میں خلل انداز نہیں ہو سکتی، پھر ان چیزوں کو محفوظ کر دینے میں کیوں تامل کیا جائے جو بجائے خود بھی خاصی قابل قدر ہیں؟

ان چیزوں کو محفوظ کر دینے کے بدیہی فوائد سے غالباً کسی کو بھی اختلاف نہ ہو سکتا تھا مثلاً:

۱۔ نفسیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو یہ اندازہ کرنے کے لیے معقول و محکم بنیادیں مل جائیں گی کہ اقبال کے قلب و دماغ نے نشو و ارتقا کی منزلیں کس رفتار سے طے کیں۔ وہی دل اور وہی ذہن تھا جس نے ۱۹۰۰ء میں "نالہ یتیم" لکھی۔ وہی دل اور وہی ذہن تھا جس سے ۱۹۲۲ء میں "طلوع اسلام" نے تراوش کی۔ فکر و نظر کی وہی بدیع المثال کارگاہ تھی، جس میں "زبور عجم"، "جاوید نامہ" اور سب سے آخر میں "ارمغان حجاز" ڈھل کر نکلی، جو میرے ناچیز فہم و اندازہ کے مطابق آج حقیقی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن ابتدائی نظم اور آخری نظم میں کم و بیش چھتیس سینتیس سال کا فصل ہے اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس لمبی مدت میں اقبال کے فکر و نظر اور دل و دماغ ایک ہی سطح پر رہے، یعنی ان میں حرکت و بالیدگی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگر ہم اس مدت میں نشو و ارتقا کے مختلف مدارج و مراحل تلاش کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اور جو کچھ مل سکے، اسے بھی ان مواد میں شامل کر لیا جائے اگرچہ وہ ۱۹۰۰ء سے بھی پیشتر کا ہے کہ ہمارے موازنے کے لیے زیادہ وسیع سامان پیش نظر آجائے؟

۲۔ عام اہل علم و ذوق کو معلوم ہو سکے گا کہ اقبال بھی مشق و نمو کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اعلیٰ درجے پر پہنچے۔ عام حیثیت سے تدریجاً ترقی کرنے اور پایہ بہ پایہ اوپر پہنچنے سے کسی بھی انسان کو مفر نہیں، اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا ہو۔ بے شک

ترقی و عروج کی رفتار اور اُونچے سے اُونچے درجے پر رسائی کا معاملہ خداداد صلاحیتوں کے بعد ان سے صحیح انداز میں کام لینے پر موقوف ہے۔ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض لوگ شعر گوئی میں عمر بھر ڈوبے رہے، ان کی مشق کا یہ حال تھا کہ بے تکلف کھڑے ہو جاتے تھے تو فی البدیہہ لمبی لمبی نظمیں کہہ جاتے تھے۔ ان کے اشعار دفاتر کی حیثیت میں ہمارے سامنے موجود ہیں، مگر شاید ہی کوئی مقام ایسا آئے، جہاں نظر اٹکے اور ان کا دامن کھینچے۔ بیشتر اشعار ایسے ملیں گے، جن میں فکر یا بیان کی کوئی بھی خوبی نہ ہوگی۔ پھر ایسے لوگ بھی ملیں گے، جن کی صلاحیتیں بڑی نادر تھیں، مگر وہ جس مشغلے کے لیے موزوں تھے، اس کے بجائے کسی دُوسرے دائرے میں مصروفِ عمل رہے۔ یہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ تھا، اس وجہ سے نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جنھیں قدرت نے خاص جوہروں سے نوازا، پھر اُنھوں نے ان جوہروں سے پُورا فائدہ اٹھایا یعنی انھیں زیادہ سے زیادہ نشو و نما دی اور وہ درجہ حاصل کر گئے، جو سب کے لیے باعثِ رشک ہے۔

۳۔ اقبالؔ نے ابتدائی دور کی بعض لمبی نظمیں ہی حذف نہ کیں بلکہ جن نظموں یا غزلوں یا دوسری چیزوں کو انتخاب میں شامل کیا تو ان کے اشعار میں بھی جا بجا خاصی تبدیلیاں کر لیں۔ بعض شعر بالکل حذف کر دیے۔ بعض میں جزوی ترمیم مناسب سمجھی، بعض کی ترتیب بدل دی۔ ان کے تمام شعر محفوظ ہو جائیں تو اہلِ علم و ذوق کو حذف و ترمیم یا تغیرِ ترتیب پیشِ نظر رکھ کر اقبالؔ کے معیارِ شعر و نقطۂ نگاہ کا صحیح اندازہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ مطالعۂ اقبالؔ کے سلسلے میں اس شے کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ کسی خاص تشریح کی محتاج نہیں۔ مثالیں میں آگے چل کر پیش کروں گا۔

ان بدیہی فوائد کے پیشِ نظر میرا خیال یہ تھا کہ جن نظموں، غزلوں یا اشعار کو حذف یا ترمیم کیا گیا، اُنھیں پہلی شکل میں محفوظ کر دینا ضروری ہے اس لیے کہ وہ مُطالعۂ اقبالؔ کا بڑا ہی گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ممکن ہے مندرجہ بالا نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ ہو، اس لیے کہ زیادہ تر لوگ نہ باریکیوں اور دقیقہ سنجیوں

بیں جانتے ہیں اور نہ جاننا پسند کرتے ہیں۔ لیکن حقیقی مطالعہ تو وہی ہے، اگرچہ اسے بہت تھوڑے افراد تک محدود سمجھا جائے۔ اور اقبال کو سمجھنا ہے تو اس کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ ان باریکیوں، نزاکتوں، لطافتوں اور نکتہ نوازیوں کی تلاش میں وادیاں قطع کی جائیں۔

سب سے آخر میں یہ کہ یہ دورِ حاضر کی اس محبوب شخصیت کا کلام ہے، جس سے بڑھ کر پُرخلوص اور بے غرض محبت و عقیدت کے جذبات عوام کے سینوں میں کسی کے لیے موجزن نہ تھے اور اسے یقیناً محفوظ ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ محبوب کی ہر شئے طبعاً محبوب و دل پسند ہوتی ہے۔

غرض میں ابتدا ہی سے ان اصحاب کا ہم نوا اور ہم آہنگ تھا، جو اقبالؒ کے اس قلم زدہ کلام کی فراہمی اور تحفظ کو بھی حد درجہ ضروری سمجھتے تھے اور اس کے وجوہ و دلائل کے باب میں جو کچھ اجمالاً اُوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نہ وہ کسی تفصیل و تشریح کا محتاج ہے اور نہ ان دلائل میں کسی اضافے کی ضرورت ہے۔ دُنیا کی کون سی زبان ہے جس میں بے شمار لوگوں نے شعر نہیں کہے، ہزاروں ایسے شاعر بھی گزرے ہیں جن کے مستند اور منتخب کلام میں سے بھی بہت کم اشعار ملیں گے، جنھیں واقعی شعر کہا جا سکے، لیکن چند شاعر ایسے بھی گزرے ہیں، جن کی ہر چیز سے اربابِ ذوق کے فکر و نظر کو خاص روشنی ملتی ہے اور آرزو رہتی ہے کہ جو کچھ میسّر آیا ہے، اس کے سوا بھی میسّر آ جائے تو اسے اپنی چشمِ بصیرت کا سُرمہ بنائیں۔ اقبالؒ بے شائبۂ ریب ایسے ہی چند شعرا میں سے تھے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اگر کہا جائے کہ صرف اردو اور فارسی نہیں بلکہ دُنیا کی کسی بھی زبان میں اس پایے کے شاعر بہت ہی کم ملیں گے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی قلمزدہ نظموں، غزلوں اور قطعات میں بھی ندرتِ فکر، جدّتِ تخییل اور رفعتِ بیان کی سحر انگیزیاں اور معجز طرازیاں نہایت اعلیٰ پیمانے پر موجود تھیں اور اکثر مشہور شعرا کے مستند کلام میں بھی یہ محاسن شاید ہی اس کثرت سے مِل سکیں جس کثرت سے اقبالؒ کے متروکہ کلام میں موجود ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے بدرجہا زیادہ اہم وہ شئے

ہے، جیسے نظم کا خاکہ یا نقشہ کہنا چاہیے یعنی جو موضوع پیش نظر ہے، اسے زیادہ سے زیادہ بدیع، پُرتاثیر اور دلکش و دل آویز انداز میں پیش کرنے کا طریقہ! اقبال کے کلام کا یہ پہلو ایسا ہے کہ میرے علم اور اندازے کے مطابق اُسے اُبھارنے اور نمایاں کرنے پر اب تک پُوری توجہ نہیں کی گئی حالانکہ صرف یہی پہلو سامنے رکھ لیا جائے تو اقبال کی عظمت آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں ہو جاتی ہے۔

میں نے "شکوہ" کے متعلق سرسری گفتگو کے سلسلے میں بھی اس پہلو کی طرف اشارے کیے تھے اور ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر زیادہ تفصیل سے بحث کروں گا جو پیش نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ یہاں برسبیلِ توضیح مدعا چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال کی ایک مختصر سی نظم ہے، جس کا عنوان ہے "حضور رسالت مآب میں" یہ بانگِ درا کے حصۂ سوم میں شامل ہے۔ اس کا موضوع "شہدائے طرابلس" ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اچانک طرابلس پر حملہ کر دیا۔ عربوں نے دورِ حاضر کے آلات و اسلحہ حرب سے محرومی اور یورپی تربیتِ عسکری سے ناآشنائی کے باوجود صرف غیرت و حمیت اسلامی کی بنا پر اس پُرجوش انداز میں مزاحمت کی کہ اٹلی کی فوجیں ساحلی حاشیے سے آگے نہ بڑھ سکیں بعض مجاہد ترک افسر بھیس بدل کر مصر کے راستے طرابلس پہنچے اور انھوں نے غیر منظم عربوں کو جابجا چھوٹے چھوٹے دستوں میں منظم کر دیا۔ ان میں سے غازی انور پاشا کے کارناموں کو ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ صدرِ اوّل کے مجاہد مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ طرابلس پر اٹلی کی اس یورش نے پاک و ہند ہی نہیں، دنیا کے ہر حصے میں مسلمانوں کے اندر ایک خاص جوشِ حمیت تازہ کر دیا۔ جو چند اہم واقعات عالمِ اسلام میں ہمہ گیر بیداری پیدا کرنے کے موجب بنے، ان میں سے ایک نہایت اہم واقعہ حملۂ طرابلس بھی تھا۔

اس واقعے پر ۱۹۱۱ء میں بہ طریق نظم و نثر بہت کچھ لکھا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور کی طنزیہ نظمیں بڑے

شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اقبال نے اس پر بارہ شعر کی ایک نظم کہی، جس میں سے ایک شعر "بانگِ درا" کی ترتیب کے وقت حذف کر دیا، لیکن انھوں نے اپنے تاثرات جس انداز میں پیش کیے، وہ پوری نظم کے خاکے سے واضح ہو سکتا ہے اور بے خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسے واقعے کے لیے اس قسم کا بدیع اور نادر خاکہ شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہو۔ فرماتے ہیں:

۱۔ زمانے کا ہنگامہ میرے لیے حد درجہ گراں ہو گیا تو میں نے، رختِ سفر باندھا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہاں رہ کر شام و سحر کی قید میں زندگی تو گزار لی مگر یہاں کے دیرینہ نظام سے شناسائی پیدا نہ کی۔ فرشتے مجھے بزمِ رسالت میں لے گئے اور آیہ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کر دیا۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی لطف و نوازش سے خطاب فرمایا: اے باغِ حجاز کی بلبل! تیری نواؤں میں ایسی گرمی، اتنی حرارت اور اس درجہ سوز ہے کہ ہر دل کی کلی پگھل گئی ہے۔ تو چمن زارِ دہر سے یہاں آیا ہے بتا، ہمارے لیے کون سا تحفہ لے کر آیا ہے؟

۳۔ میں نے عرض کیا حضور! دنیا میں اطمینان و آسودگی تو ناپید ہے۔ انسان جس زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، وہ تو میسّر نہیں آئی۔ اس باغ میں ہزاروں لالہ و گل موجود ہیں، مگر ایک بھی کلی ایسی نہیں ملتی، جس میں وفا کی خوشبو موجود ہو۔ غرض ایسی کوئی چیز تو تھی نہیں جو حضورؐ کے لیے موزوں نذر بن سکتی، مگر میں ایک آبگینہ لے آیا ہوں، جو چیز اس میں ہے، وہ جنّت میں بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ اس میں اُمّتِ حضورؐ کی آبرو جھلک رہی ہے، یعنی طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھرا ہے۔

اب آپ اشعار سے قطع نظر کرتے ہوئے اس خاکے پر غور فرمائیں۔ دنیا سے رخصت ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضری، حضورؐ کا ارشاد کہ کوئی تحفہ ہمارے لیے بھی ہے؛ اس موقع پر پوری کائنات میں سے شہیدانِ طرابلس

کے خون کو بہ رنگِ آبروے ملت پیش کرنا۔ دیکھیے خاکے نے اصل معاملہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پھر اشعار کی خوبی و دل آویزی پر توجہ کیجیے:

۱۔ ایک مسلمان کے لیے کائنات میں اس سے بڑی آرزو کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا سے رخصت ہو کر دربارِ رسالت میں حاضری کا شرف حاصل ہو؛

۲۔ ادب کا یہ مقام ملاحظہ فرمائیے کہ خود وہاں نہیں گئے بلکہ کہا: فرشتے لے گئے۔

۳۔ پھر ضمناً دنیا کی عام حالت بھی بیان کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ تحفے کا ذکر فرمایا تھا اس لیے حالت ایسے انداز میں بیان کی کہ تحفے کے لائق جو نمایاں چیزیں ہو سکتی تھیں، انھیں کی نفی کی، آخر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو پیش کر دیا۔

شہیدانِ طرابلس مظلوم تھے۔ ان پر بلا وجہ حملہ ہوا۔ بے سرو سامانی کے باوجود انھوں نے بہ تقاضاے غیرت و حمیت فریضۂ جہاد کی بجا آوری کے لیے کمرِ ہمت باندھی اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے بے دریغ جانیں دینے لگے۔ دشمن کی قوت بہت زیادہ تھی اور یورپ کی تمام طاقتیں اس دشمن کی پشتیبان تھیں۔ اس لیے کہ پہلے ہی سے خفیہ خفیہ عہد و پیمان کر چکی تھیں۔ دیکھیے نظم میں شہیدوں کی مظلومیت کو بخوبی واضح کر دیا مگر انداز ایسا اختیار کیا کہ مظلومیت تصریحاً مذکور نہیں ہوئی۔ تصریحاً صرف یہ مذکور ہے کہ امتوں کی آبرو اور قوموں کی عزت شہیدوں کا خون ہے اور حق یہ ہے کہ کسی قوم کی غیرت و حمیت کا عملی ثبوت اس کے سوا ہے بھی کیا؛ جو امت اور جو قوم راہِ حق و آزادی میں قربانیاں نہیں کر سکتی اپنے آپ کو اغیار و اجانب کی محکومی یا ظلم و باطل کی چیرہ دستی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی، اسے عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنے کا کیا حق ہے؟ کون ہے جو اسے احترام کی نظروں سے دیکھے گا، خواہ اس کے اردگرد مادی دولت و ثروت کے کتنے ہی گراں قدر انبار موجود ہوں؛ قوموں کی زندگی

کا اصل سرمایہ جذبہ حریت ہے اور حریت کے لیے جانبازی پر آمادہ ہو جانے سے بڑھ کر کوئی خوبی اور اچھائی نہیں اسی پہلو کو ابھارا تا کہ قوم شہادت زار طرابلس سے صحیح تاثر قبول کرے۔ ویسی ہی قربانیوں کے لیے تیار ہو جائے اور انھیں اپنے لیے باعثِ صد افتخار سمجھے۔

اقبال کی ایک نہایت نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ حد درجہ درد انگیز اور غم ناک قومی واقعات کو بھی ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان سے قوم کی روحِ عمل کے لیے سامان حرکت مہیّا ہو اور اس کے رہوارِ عزت و ہمت کے لیے واقعات مہمیز بن جائیں۔ یہ نہ ہو کہ افسردگی، دل گرفتگی اور پژمردگی پیدا ہو، جو چمنستانِ حیات کے لیے بادِ زمہریر کا حکم رکھتی ہے کہ ادھر چلی اور ادھر شاخساروں کی قوتِ نمو منجمد ہو کر رہ گئی۔ پتے جھڑ گئے۔ پودوں کی تازگی و شادابی ختم ہو گئی۔ ہر طرف بے رونقی چھا گئی۔ یعنی قوم میں عمل کی روح اگر تھی بھی تو وہ مضمحل ہو کر رہ گئی۔

مولانا رومؒ نے فرمایا تھا:

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است
ایں گنہ از صد صواب اولیٰ تر است

معلوم ہے کہ خون کو پاک نہیں سمجھا جاتا۔ اگر باوضو آدمی کے جسم سے خون نکل آئے اور اس طرح کہ منفذ سے نکل کر ذرا بھی پھیل جائے تو وضو باقی نہیں رہتا۔ لازم ہو گا کہ خون کو دھو کر وضو کی تجدید کی جائے۔ میّت کو پانی سے غسل دے کر پاک کیا جاتا ہے مگر شہیدوں کو غسل نہیں دیا جاتا۔ انھیں خون میں لتھڑے ہوئے ہی دفن کر دیتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ شہیدوں کے لیے خون پانی سے بدرجہا افضل و اولیٰ ہے۔ دوسروں کے لیے یہ منافیِ پاکیزگی ہے لیکن شہیدوں کے لیے یہ پاکیزگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ کم از کم پانی پر اسے ضرور ترجیح حاصل ہے۔ عرفی نے بھی شہادت ہی کا خون پیش نظر رکھتے ہوئے کہا تھا:

تو زیک قطرہ خوں ترک وضو گیری و ما　　سیلِ خوں از مژہ ریزیم و طہارت نہ رود

یہ صرف ایک مثال تھی کہ نظم کے خاکے کو کتنا اونچا درجہ حاصل ہے اور اقبال کی اکثر نظموں میں رفعت و بلندی ہی نہیں بلکہ یگانگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ خاکہ بہت ہی اچھوتا تجویز فرماتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً غرّہ شوال یا ہلالِ عید کو دیکھیے۔ ابتدا میں ہلال کو خطاب کیا ہے اور اس سلسلے میں ہلال کے ساتھ امت کے گہرے تعلق کی کیفیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو بلندی پر دور و سیر میں مصروف ہے۔ وہاں سے ہمارے گھر کی پستی بخوبی نظر آ سکتی ہے۔ ذرا اس پر بھی ایک نظر ڈال لے۔ پھر مسلمانوں کی ایک ایک مصیبت، ایک ایک درماندگی، ایک ایک پریشان حالی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس پس منظر نے ان حالات میں تاثیر و نفوذ کی قوت کو بجلی کی قوت سے بھی بدرجہا زیادہ بے پناہ بنا دیا ہے۔

سسلی والی نظم پر ایک نظر ڈالیے۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے آ رہے تھے۔ جہاز مینا کی بندرگاہ سے گزرا تو دائیں جانب سسلی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ بائیں جانب اٹلی کا ساحل تھا۔ سسلی کی روشنیاں دیکھتے ہی اس کی پرانی تاریخ کی یاد تازہ ہو گئی، جب مسلمان اس جزیرے پر حکمران تھے۔ شدتِ تاثر نے نظم کی صورت اختیار کی۔ لیکن دیکھیے، پہلے شعر میں دیدۂ خونناب بار کو رونے کی دعوت دے کر مسلسل چار شعروں میں مسلمانوں کے بنیادی اوصاف نہایت پُر تاثیر انداز میں پیش کیے جو کشوروں اور اقلیموں، جزیروں اور سمندروں کو مسخر کرتے ہوئے وقت کی معروف دنیا میں پھر نکلے تھے۔

فرماتے ہیں:

وہ صحرانشیں تھے، مگر سمندر کے سینے پر ان کے سفینے کھیلتے پھرتے تھے یعنی خشک و تر ان کے لیے یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کے درباروں میں زلزلے ڈال دیے تھے۔ ان کی تلواروں میں بجلیوں نے اپنے آشیانے بنا لیے تھے۔ وہ منظرِ عالم پر نمودار

ہوئے تو ایک نئے جہان، ایک نئی دنیا کا پیغام لائے۔ ان کی وہ تلوار جو صبر سے ناآشنا تھی
عہدِ کہن کو کھا کر ختم کر گئی۔ جہان مر چکا تھا۔ ان کے لبوں سے "قُم" کی آواز بلند ہوئی تو وہ پھر
جی اُٹھا اور انسان کو اوہام کی زنجیروں سے رہائی مل گئی۔

یہ زندگی کے ایسے حقائق ہیں، جن سے مخالف و معاند بھی اختلاف کی جراُت نہیں کر سکتا، لیکن واضح رہے کہ اقبالؔ کی زبان سے موجودہ و آیندہ اسلامی نسلوں کے لیے ایک حقانی دعوت بھی ہے، جس میں سسلی کی پرانی یاد کے پس منظر نے ایک خاص تاثیر پیدا کر دی ہے۔

پھر اس سلسلے میں مختلف اسلامی مرکزوں کی تباہی کا ذکر آگیا اور اقبالؔ نے ایک ایک کی تباہی کی یاد شاعروں کے مرثیوں سے تازہ کی یعنی بغداد برباد ہوا تو سعدیؔ نے اس کا مرثیہ کہا۔ دہلی پر ۱۸۵۷ء میں تباہی آئی تو داغؔ نے اس پرخون کے آنسو بہائے۔ دولت غرناطہ مٹی تو ابن بدرون کے دردمند دل سے فریاد کا طوفان اٹھا۔ بغداد، دہلی اور غرناطہ پر ماتم و اشکباری ہو چکی۔ اے سسلی! تیری گزشتہ عظمت پر نوحہ خوانی کے لیے تقدیر نے میرا دل چن لیا، جو تیرا محرم تھا۔

بہرحال متروکہ نظموں، غزلوں اور شعروں کو محفوظ کر لینے کے دلائل بڑے قوی اور محکم تھے۔ علم و ادب کی یہ گراں قدر دولت اس وجہ سے بھی قابلِ حفاظت تھی کہ اس میں اقبالؔ کے کمالاتِ فطری کی تابانی و درخشانی کے گوناگوں جلوے نمایاں تھے۔ اس وجہ سے بھی قابلِ حفاظت تھی کہ معلوم کیا جا سکتا تھا، اقبالؔ نے کیوں ان اشعار کو اپنے مستند کلام میں شامل نہ کیا، ان میں بیان یا فکر کے ایسے کون سے پہلو تھے، جن کی وجہ سے یہ اشعار اقبال کی نگاہوں میں معیاری قرار نہ پائے، اس طرح شاعری کے متعلق مرحوم کے نقطہ نگاہ کی ہم بہتر توضیح کر سکتے ہیں اور مثالوں سے اس توضیح کو

پختہ و پایدار بنا سکتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ خود اقبال نے جن چیزوں کو قلم انداز کر دینا مناسب سمجھا، اس لیے کہ وہ ان کے نزدیک معیاری نہ تھیں تو ہم کیوں انھیں بالاہتمام بروئے کار لائیں؟ کیا ہم غیر معیاری چیزیں محفوظ کر کے ان کی کوئی خدمت انجام دیں گے؟ تو بادی النظر میں یہ بات جتنی وزنی معلوم ہوتی ہے، دراصل اتنی وزنی نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

۱۔ اقبال کا مستند کلام زیادہ سے زیادہ شہرت پا چکا ہے۔ ان کی تصانیف معلوم و معروف ہیں۔ اب کوئی نئی چیز ان میں داخل نہیں ہو سکتی اور ایسا کوئی اندیشہ نہیں کہ ان کی ابتدائی چیزوں یا قلم انداز کیے ہوئے شعروں کو مرتب کیا جائے گا تو معاذاللہ مرحوم کے لیے سبکی کا کوئی پہلو پیدا ہوگا۔

۲۔ اقبال کے پیش نظر صرف ایک خاص تعلیم تھی، ایک خاص پیغام تھا۔ ہمارے پیش نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں جو مطالعہ اقبال کے اہم اجزا ہیں۔

۳۔ خود ان نظموں میں بھی اس مرحوم کی عظمت کے بعض ایسے پہلو موجود ہیں جو اکثر دوسرے شعرا کے مستند اشعار میں بھی بہت کم نظر آئیں گے۔ مثلاً صرف اسی پہلو کو دیکھیے کہ ایسے بلند پایہ اشعار محض اس لیے نظر انداز کر دیے کہ فکر و نظر کے اعتبار سے ان کے نزدیک معیاری نہ تھے یا جو پیغام ان کی زندگی کا نصب العین تھا، اس سے ان اشعار کو زیادہ مناسبت نہ تھی۔

تاہم یہ سوال کم اہم نہ تھا کہ انھیں کس صورت میں محفوظ کیا جائے؟ آیا بعض مختلف رسائل و جرائد فراہم کر کے نظمیں نقل کرا دی جائیں اور ویسا ہی ایک نیا مرقع تیار کر دیا جائے، جیسے مرقعے پہلے شائع ہو چکے تھے؛ یا پورے ذخیرے کو ایسے انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اہلِ ذوق کے لیے زیادہ سے زیادہ بصیرت افروز

ہو اور اس کے مطالعے سے کلامِ اقبال پر غور و فکر کی نئی راہیں کھلیں؟

ظاہر ہے کہ ترتیب کا صحیح طریقہ پہلا نہ تھا دوسرا ہی تھا۔ یہ کام میرے عزیز دوست صادق صاحب دلاوری نے انجام دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجموعہ انھیں کی سعی و کاوش کے باعث طباعت کے قابل ہوا۔ بلاشبہ بکھرے ہوئے کلام کی فراہمی بڑی محنت طلب تھی، لیکن ان متفرق اجزاء کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ کر "گل" بنانے کا سہرا دلاوری صاحب ہی کے سر ہے۔

علاوہ بریں مختلف نظموں کے آغاز میں ایسی عبارتیں لکھ دی گئی ہیں جن سے ان کی تاریخی حیثیت، پس منظر اور دُوسرے ضروری نکات واضح ہو سکیں۔ جہاں جہاں تصریحات ضروری محسوس ہوئیں، اختصار سے حاشیے میں ان کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعے میں قارئین کو سہولت رہے۔

ایک حد درجہ ضروری کام یہ تھا کہ اقبال نے جو نظمیں حذف و ترمیم کے بعد اپنے مستند کلام میں شامل کیں، ان کے بارے میں کوئی ضروری چیز نظر انداز نہ ہوتی، یعنی یہ کہ کن کن اشعار میں تبدیلیاں کیں؛ کیا کیا تبدیلیاں کیں؛ کن اشعار کی ترتیب بدلی؛ کن کن کو حذف کیا؛ یہ اشعار ایسے انداز میں پیش ہونے چاہئیں تھے کہ پڑھنے والے ذرا غور فرماتے ہی حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جاتے۔ یہ کام بھی میرے عزیز دوست ہی نے انجام دیا۔

اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ نظم ہمالہ کا ایک بند ابتدا میں یوں تھا:

نہر چلتی ہے سرود و خامشی گاتی ہوئی　　　آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی　　　ناز کرتی ہے فراز راہ سے جاتی ہوئی

"بانگِ درا" میں اس بند کو یہ شکل دی گئی ہے :-

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی ۔۔۔ کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی ۔۔۔ سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

شعر کا معمولی سا بھی ذوق رکھنے والے شخص پر بہ یک نظر واضح ہو جائے گا کہ اس جزوی ترمیم نے بند کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ شاعر ہمالہ پہاڑ کے مختلف مناظر کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ندی کا منظر بھی پیش کیا اور معلوم ہے کہ ندی پہاڑ کا ایک عام منظر ہے۔ بلند چوٹیوں سے چشموں یا برف کا پانی بہ بہ کر نشیب میں جمع ہوتا ہے اور آبِ رواں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے شاعر بادل اور ہوا کے نقشے پیش کر چکا ہے۔ پھر کہتا ہے ندی کو دیکھو، یہ کتنی پاکیزہ، مصفیٰ اور خوش منظر ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کوثر و تسنیم کی موجیں بھی اس کے حسن و خوبی کو دیکھ کر عرق عرق ہو رہی ہیں۔ پھر اس پانی میں قدرت کی ہر شئے منعکس ہے۔ سورج، چاند اور تارے، بلند پہاڑوں کی چوٹیاں، چیڑ اور دیودار کی قطاریں، رنگ بہ رنگ پھول، سب کی تصویریں اس میں نظر آتی ہیں۔ گویا یہ ندی نہیں ایک طلسمی آئنہ ہے جو شاہد قدرت کو دکھایا جا رہا ہے۔ پھر اس کی روانی کے انداز کا اندازہ کرو۔ چونکہ اس کے پانی میں دریا کا سا زور نہیں بلکہ یہ ابھی جاری ہوئی ہے، اس لیے پتھر راستے میں آجاتے ہیں تو کبھی ان سے پہلو بچاتی ہوئی نکل جاتی ہے اور کبھی جی میں آتا ہے تو کسی سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی منظر کشی شاعری میں معجز نمائی سے کم نہیں کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے حد درجہ سادہ، طبعی اور وقوعی ہے، ساتھ ہی حد درجہ دل کش اور دل آویز بھی ہے۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں ندی والا مصرع "فلسفۂ غم" میں بھی آیا ہے، جہاں زندگی کے تسلسل کو ایک مثال میں نمایاں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے صحرا کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

یعنی جہاں ندی اوپر سے چٹان پر گری، اس کی روانی اور تسلسل کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ ندی کی جگہ مضطرب بوندوں کی ایک دنیا نمایاں ہو گئی، لیکن دو قدم آگے کی طرف نظر اٹھایئے۔ معلوم ہو گا کہ وہ تمام بوندیں مل کر پھر چاندی کے تار کی طرح ندی کی شکل اختیار کر گئیں۔ بالکل اسی مثال کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے۔ یہ ندی کی طرح چلی آ رہی ہے۔ یکایک موت سے سابقہ پڑ جاتا ہے گویا زندگی کی ندی کا آئینہ بھی چٹان پر گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، مگر پھر وہ سب الگ الگ قطرے مل کر ندی بن جاتے ہیں۔ گویا موت بیچ میں ایک عارضی حالت ہے، اس سے زندگی کی جوئے رواں کے عام بہاؤ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

"گل رنگیں" پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کا پہلا بند ابتدا میں یوں تھا:

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
واقفِ افسردگی ہائے طپیدِ دل نہیں

زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں
کیوں یہ تسکینِ خموشی زا مجھے حاصل نہیں

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

دیکھیے، کتنے پاکیزہ تاثرات تھے۔ پھول سے کہتے ہیں: تو عقدۂ مشکل کو کھولنے کی زحمت سے آشنا نہیں۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ دل تڑپتا ہے تو اس پر کس طرح افسردگیاں چھا جاتی ہیں۔ تو محفل میں تو موجود رہتا ہے، لیکن اس کی شورش میں شریک نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی ذات میں ہمہ وجوہ مطمئن ہے اور تیرا اطمینان اس درجہ ترقی کر چکا ہے کہ اس نے تجھ پر خاموشی طاری کر دی ہے۔ تیری پتیوں کی وضع قطع زبانوں کی سی ہے۔ اگرچہ قدرت نے تجھے سوز بانیں بخش دی ہیں، مگر کوئی بھی لذتِ گویائی سے بہرہ مند نہیں۔ سب پر سکوت طاری ہے۔ کیوں؟ میں سمجھتا ہوں، اس لیے کہ تیرے سینے میں کوئی بھید چھپا ہوا ہے، جسے تو چھپائے رکھنا چاہتا ہے۔ بولتا اس لیے نہیں کہ ممکن ہے زبان کشائی کے ساتھ ہی وہ بھید لب پر آجائے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا بھید ہے جسے چھپانے کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ سوزبانیں ہونے پر بھی خاموشی ہی کو ترجیح دی گئی؟

مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مصرعوں کی بندشیں پسند نہ تھیں، اس لیے انھیں بدل دیا۔ اب یہ بند یوں ہو گیا:

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں　　یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اب بند اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بدرجہا بلند تر ہو گیا۔ عقدۂ مشکل کی خراش سے وہی شناسا ہوتا ہے، جس کے پہلو میں دل ہو۔ پھر انسان اور گلِ رنگیں کے درمیان کتنا بڑا فرق واضح کر دیا۔ یعنی پھول محفل کی زینت بنا رہتا ہے اور اس کی شورش میں شریک نہیں ہوتا، لیکن انسان کو بزمِ ہستی میں رہ کر یہ فراغت نصیب نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ صاحبِ دل ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک سوز و سازِ آرزو ہے اور پھول کی زندگی آرزو کے گداز سے سراسر بے بہرہ ہے۔

"ابرِ کوہسار" میں سے جو بند حذف کر دیے گئے، ان میں سے ایک یہ تھا:

چاکِ دامن سے دمکتے نظر آئے اختر — کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر

گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر — مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر

مضمون سراسر حقیقت پر مبنی تھا۔ یعنی رات کا وقت ہو، بادل چھایا ہوا ہو۔ گھٹاٹوپ اندھیرا ہو۔ اس وقت تیز ہوا چلنے لگے تو بادل جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے اور روزنوں ہی سے تارے دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر ابر کہتا ہے کہ میں چلنے میں کتنا غافل ہوں۔ یکایک دامن کی گرہ کھل کر موتی گر پڑتے ہیں اور مجھے گرہ کے کھل جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ بھی بالکل ایک طبعی کیفیت ہے۔ بادل برستا ہے تو اس کا نقشہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دامن میں جتنے موتی باندھ رکھے تھے، گرہ کھل جانے سے وہ سب کے سب زمین پر گر پڑے۔ مگر یہ بند بداہتہً اس لیے ترک کیا گیا کہ اسلوبِ بیان معیاری نہ تھا

"خفتگانِ خاک سے استفسار" میں بعض بڑے اچھے شعر تھے، جنھیں قلمزد کر دیا گیا مثلاً:

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا؟
اس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟
یہ خوشامد اس ولایت کا بھی کیا دستور ہے؟
واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟
واں کی عزت بھی حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟
واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟
آہ! اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں،
واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

کیا آپ سمجھتے ہیں شاعر نے یہ سوالات اس لیے کیے کہ جواب مل جائے؟ حاشا وکلا، بلکہ وہ اپنے دور، اپنے عہد اور اپنے ماحول کے حالات و کوائف پیش کرنا چاہتا ہے، جو خفتگانِ خاک سے استفسار کے پس منظر میں حد درجہ پرتاثیر بن گئے ہیں یعنی شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ ہمارے ہاں تو غریبوں کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں خوشامد پر مدار ہے اور دل کا آئینہ ریاکاری کے پتھر سے ریزہ ریزہ ہے۔ عزت یا حکومت کی حیثیت بلبلے کی مانند ہے۔ یہاں صرف دولت اور ثروت کو شرافت کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے، سیرت و کردار پر کسی کی نظر نہیں۔ کسی میں جوہر قابل ہو تو یہاں کوئی اس کا احترام نہیں کرتا۔ کیا خفتگانِ خاک کی دنیا کا بھی یہی حال ہے؟

"سرسید کی لوحِ تربت" میں سے جو شعر چھوڑے گئے، ان کی حیثیت بھی یہی تھی، یعنی بہ ظاہر مقصود نصیحت تھی، مگر حقیقت میں جو کچھ اقبالؔ کے گردوپیش ہو رہا تھا، اس کی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی،\
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی

دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو\
آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو

گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں\
یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں

راہبر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے،\
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے،

ہو شرابِ حُبِ قومی سے اگر سرشار تُو\
ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو

اب ایک دو لمبی نظموں کے متعلق چند گزارشات ملاحظہ فرمالیجیے:

"نالۂ یتیم" سب سے پہلی نظم تھی جو اقبالؔ نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی اور اسی سے ان کی ہمہ گیر شہرت کا آغاز ہوا۔ میں اس کے اشعار یا اسلوبِ بیان پر بحث نہیں کروں گا، لیکن اس کے نقشے پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اس سے پہلے بھی یتیموں کے متعلق بہت سی نظمیں لکھی گئی ہوں گی اور انجمن حمایتِ اسلام کی ابتدا چونکہ یتیم خانے کی بنیاد سے ہوئی تھی، اس لیے یہ موضوع اس کے سالانہ جلسوں میں شاعروں، واعظوں اور خطیبوں کے لیے بہ طورِ خاص مستحق توجہ ہوگا، لیکن اقبالؔ کی نظم کے نقشے کو سرسری نظر سے ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس نقشے ہی نے نظم کو حد درجہ اثر انگیز اور قیامت خیز بنا دیا۔

ابتدا کے چند بندوں میں درد و غم کی عام کیفیت کا اظہار ہے۔ پھر یتیم کی زبان سے "ظلِ دامانِ پدر" کا ذکر فرماتے ہوے کہتے ہیں۔

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِ دامانِ پدر ‏‏ ‏‏ غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گزر
رہنما ہے وادیِ عالم میں تو مثلِ خضر ‏‏ ‏‏ تُو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سر بسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہما تاثیر ہے
تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

یتیم کو اپنی بے کسی یاد آتی ہے، ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے کہ دُنیا کی کوئی بھی شے سہارے اور رفاقت سے محروم نہیں؛ صرف یتیم ہر سہارے سے محروم ہے۔

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری ‏‏ ‏‏ اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری
کوہ و دریا میں ہے قائم شانِ سلطانی تری ‏‏ ‏‏ اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظم عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بے کسی،

اسی طرح روتے دھوتے یتیم کو وہ مقدس آستانہ یاد آجاتا ہے، جو کائنات انسانیت کی پناہ گاہ ہے اور جس کی آغوشِ رحمت میں پہنچنا ہر انسان کے لیے سعادتِ دارین کی دستاویز ہے۔ دیکھیے یتیم کس انداز سے اس آستانے پر پہنچ کر اپنی کیفیت بیان کرتا ہے:

اے مددگارِ غریباں، اے پناہِ بے کساں
اے نصیرِ عاجزاں، اے مایۂ بے مایگاں

کارواں صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں
کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلِ مشکل کے لیے
نام ہے تیرا شفا دُکھتے ہوئے دل کے لیے

یتیم اپنا درد بھی کہتا جاتا ہے، ساتھ ساتھ نئے انداز کی نعت بھی اس کی زبان پر جاری ہے نعت کے مضامین ملاحظہ ہوں:

دل ربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو
مثل آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تو

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو، وہ گوہر ہے تو
از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا
تھی مؤخر سب سے آمد پر مقدم تو ہوا

اس کے بعد حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس فریاد کو سُن کر ارشاد فرماتے ہیں:

میری اُمت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں؛
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں؛

ہے اور ضرور ہے:

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں — میری اُمت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحان صدق و ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں — ان مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل و جان سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

دیکھیے، یہ بالکل ابتدائی نظم ہے، لیکن اقبالؔ کو خدا نے جو دل و دماغ عطا کیا تھا، وہ ابتدا میں بھی فکر و نظر کے اعتبار سے یگانہ تھا۔ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے یہاں پہنچ کر کیا رنگ اختیار کرتا مگر اقبالؔ ہمیشہ مسلمانوں کے محاسن ہی نمایاں کرتے رہے اور اسی ذریعے سے ان میں عمل کی تحریک فرماتے اور انھیں سرگرمی کار کی دعوت دیتے رہے انھیں حمیت امتحان صدق و ہمت اور غیرت میں سب سے بڑھ کر قرار دیا۔ فرمایا کہ وہ خدا کے نام پر دل و جان سے فدا ہیں اور ایسے انسان ہیں کہ فرشتے بھی ان پر فدا ہوں۔

اب ایک اور نظم پیش نظر لائیے، جس کا موضوع اس سے بالکل مختلف تھا یعنی "ملکہ وکٹوریا کا مرثیہ"۔ یہ بھی ابتدائی دور کی نظم ہے۔ اقبالؔ نے متعدد مرثیے کہے اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ کوئی ایک بھی دوسرے سے نہیں ملتا، ہر مرثیے کا رنگ اور انداز دوسرے سے الگ ہے۔ میرے علم کے مطابق سب سے پہلا مرثیہ وہی ہے، جو ملکہ وکٹوریا کی وفات پر لکھا گیا اور ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد:

۱۔ دوسرا مرثیہ داغؔ کا تھا جو ۱۹۰۵ء میں کہا گیا۔

۲۔ تیسرا مرثیہ "گورستان شاہی" ہے، یہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔

۳۔ چوتھا مرثیہ "فلسفۂ غم" ہے، جو غالباً ۱۹۱۲ء کا ہے۔

۴۔ پانچواں مرثیہ ہے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جسے میرے نزدیک دنیا بھر کی رثائی نظموں میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ چھٹا اور سب سے آخری مرثیہ راس مسعود مرحوم کا ہے۔

ملکہ وکٹوریہ والے مرثیے پر ایک مفصل نوٹ میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں اس کے مطالب کا اعادہ غیر مناسب ہوگا۔ خاص طور پر قابل غور نظم کا چوتھا بند ہے، جس میں موضوع سے قطع نظر کرتے ہوئے حکمرانی کا مثالی نقشہ پیش کیا گیا ہے اور غالباً مرثیہ کا اصل محرک یہی امر تھا۔ ملاحظہ فرمائیے مثالی حکمرانی کے خصائص کیا بیان فرماتے ہیں:

۱۔ حکمرانی یہ ہے کہ دوسروں کے غم سے آنکھیں نم آلود ہوں۔

۲۔ حکمرانی یہ ہے کہ غریبی کی شان نظر میں رہے۔

۳۔ حکمرانی یہ ہے کہ ہر فرد کے درد سے جگر تڑپ اُٹھے۔

۴۔ حکمرانی یہ ہے کہ دُوسروں کی خوشی سے دِل خوش اور دُوسرے کے رنج سے دِل رنجیدہ ہو۔

۵۔ حکمرانی یہ ہے کہ دوسروں کی بے نابیوں اور دوسروں کے درد کو اپنا لیا جائے۔

۶۔ حکمرانی یہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر بھی دوسروں کا خیال ہر وقت رکھا جائے اور تلوار کا وار کسی پر بھی ہو مگر حکمران کی ڈھال ہر وار کو روکے۔

۷۔ حکمرانی یہ ہے کہ دل محبت کی شراب سے لبریز ہو اور یہ محبت نگاہوں میں نمایاں ہو۔

۸۔ حکمرانی یہ ہے کہ جو بات زبان پر لائے وہ پاکیزہ، صاف اور بے لاگ ہو، حکمران کا دل دردمند ہی فیصلے کرے جو ازروئے حق و انصاف ہونے چاہئیں۔

۹۔ حکمرانی یہ ہے کہ دشمن بھی امان مانگے تو حکمران کی آنکھوں میں مروت آجائے۔

۱۰۔ حکمرانی یہ ہے کہ جس طرح نگاہوں میں نور رہتا ہے اسی طرح حکمران کا فرمان دلوں کی ولایت میں رواں رہے

مقابلہ مقصود نہیں، صرف برسبیل تذکرہ کہنا چاہتا ہوں کہ عین اسی موقع پر خواجہ حالیؔ مرحوم نے بھی ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ کہا تھا اور وہ جنوری ۱۹۰۱ء کے "معارف" میں شائع ہوا تھا۔ وہ بھی بڑا اچھا مرثیہ ہے۔ اس کا آغاز ہی یوں ہوتا ہے کہ کوئی شخص بادشاہ ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم، جس کی نیکیاں دنیا میں زندہ ہوں، وہ مرتا نہیں۔ جو لوگ زندگی "مرنجاں مرنج" طریقے پر بسر کرتے ہیں، غیر انھیں اپنا سمجھتے ہیں اور دشمن مہربان جانتے ہیں، وہ دنیا سے اٹھتے ہیں یعنی اس فانی زندگی سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو ان کی خوبیوں اور نیکیوں کی داستانیں ایک ایک زبان پر جاری رہتی ہیں :

اُن کا جینا کیسی نعمت ہوگی دنیا کے لیے

جن کا مرنا ان کے حق میں ہے حیاتِ جاوداں

گویا خواجہ حالیؔ مرحوم و مغفور کے پورے مرثیے میں بنیادی مضمون وہی ہے جو خواجہ شیراز نے مختصر الفاظ میں یوں پیش کر دیا تھا:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خواجہ حالیؒ نے اسے محاسن و مکارم کی تفصیل سے زیادہ مؤثر بنا دیا۔ یہ مرثیہ بھی خواجہؒ صاحب کی عام نظموں کی طرح سادہ اور سراپا ناصحانہ ہے۔ اس میں وکٹوریہ کی نیکیاں اور خوبیاں جابجا بیان کی گئی ہیں، مگر حکمرانی کا کوئی مفصّل مرقع اس طرح یکجا نہیں ملتا، جسے نظم یا مرثیے کا مرکزی نقطہ قرار دیا جا سکے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ یہاں تقابل منظور نہیں اور تقابل کی نہ ضرورت تھی اور نہ کوئی موقع اور محل تھا۔ حالی اور اقبالؔ کی عمروں میں تفاوت کی وسیع خلیج حائل تھی۔ خواجہ حالیؔ زندگی کا بڑا حصہ گزار چکے تھے اور چودہ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اقبالؔ نے ابھی خدمت عالم کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ عوام سے صرف ابتدائی شناسائی حاصل کی تھی اور ۳۸ برس سال باقی تھے، جن میں اُنھیں رفعت و سربلندی کی نئی چوٹیوں پر پہنچنا تھا۔ پھر خواجہ حالیؔ اور اقبالؔ کے دوائر فکر و نظر بھی بالکل الگ تھے۔ لہٰذا تقابل کا پائے سخن درمیان آ ہی نہیں سکتا۔ صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جس اقبالؔ نے آگے چل کر اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو اسلام اور ملّت اسلامیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اس طرح کائناتِ انسانیت کی بے مثال خدمت کے راستے ہموار کیے، وہ اپنے ابتدائی دور میں بھی عام اسلوبِ فکر اور عام افتادِ طبع سے بالکل جداگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ ممکن ہے لوگوں کو اس وقت احساس تک نہ ہو کہ جس اقبالؔ کی نظمیں شوق سے سُنی جا رہی ہیں، وہ آگے چل کر عظمت کی کن بلندیوں پر پہنچنے والا ہے یا وہ ان افرادِ جلیل و عظیم میں سے ہے، جن کا ظہور صدیوں کے بعد ہوتا ہے۔ ممکن ہے خود اقبالؔ کو بھی اپنی یگانہ صلاحیتوں کا اس وقت کوئی اندازہ نہ ہو۔ مگر ہمارے سامنے آج اس نادر الوجود زندگی کے مختلف ادوار کی داستانیں کھلی پڑی ہیں اور بے تکلّف کہہ سکتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں بھی اقبال کے فطری جوہروں کی درخشانی سب سے الگ تھی، اگرچہ منزل بلوغ پر پہنچ کر اُن جوہروں نے جو جلوہ زار پیدا کیا، وہ ابتدائی دَور کی تجلیوں سے اتنا ہی مختلف تھا، جتنا ماہِ نَو ماہِ کامل سے مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں اصلاً ایک ہی شے ہیں۔ ابتدائی جبیں نمائی کو ہم ہلال سے تعبیر کرتے ہیں اور جب پورا چہرہ بے نقاب ہو کر جگمگاتا ہے تو اسے بدر کا نام دے دیتے ہیں:

عباراتنا شتّٰی و حسنک واحد
و کل الی ذاک الجمال یشیر

یہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء کی نظمیں تھیں۔ وکٹوریہ کے مرثیے سے غالباً صرف ایک مہینا بعد اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اپنی دوسری نظم پڑھی جس کا عنوان تھا "یتیم کا خطاب ہلالِ عید" سے۔ میں اس پر یہاں تفصیلی بحث نہ کروں گا، لیکن اتنا ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ چھوٹی بحر میں حسن فکر اور اعجاز بیان کے عجیب کمالات اس نظم میں دکھائے گئے ہیں۔ "ہلالِ عید" کے لیے بے شمار تشبیہیں نظم کی ہیں، جن میں سے اکثر نئی ہیں اور لطف یہ کہ ابتدا میں تمام تشبیہیں عام نقطۂ نگاہ سے پیش کی گئیں، پھر یتیم نے ہلال کو دیکھا اور اپنا رنج وغم یاد آیا تو اس نے اپنے نقطۂ نگاہ سے "ہلال" کی تعبیر شروع کر دی، مثلاً یہ کہ اے ہلال تجھے ہلالِ عید کہنا ہرگز صحیح نہیں تو رنج وغم کی شراب کا ساغر ہے، اس لیے کہ تجھے دیکھتے ہی بیکسی اور غربت کا ماتم تازہ ہو جاتا ہے۔ تیری صورت گفتگو کرنے والے لب سے مشابہ ہے۔ بہتر ہے میرے ایسے ستم نصیبوں کی کہانی سنا دے۔ پھر یتیم ہلال کو طعنے دیتا ہے۔ کہتا ہے، تو کیا ہے؟ ایک کاسۂ سوال بن کر آ گیا ہے تاکہ سورج سے روشنی کی بھیک مانگے۔ تیری آنکھ ہر وقت چشمۂ خورشید پر لگی رہتی ہے، ادھر سے تجلی ملتی ہے تو تیرے وجود میں چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو کمال کی شراب کا پیاسا ہے۔ عید کا پیغام لے کر آیا ہے اور جن بچوں کے سر پر والدین کا سایہ موجود ہے وہ نئے لباس بنوا رہے ہیں تاکہ عید کے موقع پر پہنیں اور خوشیاں منائیں، مگر یتیم کے دل میں نئے لباس اور نئی پوشاک کا جو شوق ہے، وہ تو پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یتیم بے وسیلہ ہے؛ اس کا باپ زندہ نہیں، جو کما کر لائے اور اس کا شوق پورا کرے، لہٰذا اس کے لیے تو شرمندگی اور انفعال کا سبق بن گیا ہے۔ اس بند کا آخری شعر حد درجہ سادہ اور بے تکلف ہے، مگر دیکھیے کس درجہ پُرتاثیر ہے:

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں؟
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں!

"تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں" میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کی تفصیل دفتروں میں بیان کی جا سکتی ہے۔

پھر مختلف بندوں کے بعض منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے:

درد کو زندگی سمجھتے ہیں ۔۔۔ جاوداں ہو یہ زندگی نہ کہیں
ہوں وہ بیکس کہ ڈر رہا ہوں ۔۔۔ چھوڑ دے مجھ کو بیکسی نہ کہیں
گاہے ماہے ہلال آتا ہے ۔۔۔ ہو طلبِ نانِ مفلسی نہ کہیں

ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو
اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں

سیر میں اب نہ دل لگائیں گے ۔۔۔ کس کی انگلی پکڑ کے جائیں گے
صبح جانا کسی کا وہ گھر سے ۔۔۔ اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آ گئی جو چوٹ کبھی ۔۔۔ کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے ۔۔۔ ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے
سننے والے گزر گئے اے دل ۔۔۔ اپنے شکوے کسے سنائیں گے

عید آئی ہے، اے لباسِ کہن
اب ترے چاک پھر سلائیں گے

اک بہانہ ہلالِ عید کا ہے ۔۔۔ قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
ہاں بتا دے فلک کہ طفلی میں ۔۔۔ درد کو کس طرح چھپاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا کوئی ۔۔۔ جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں

ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے
یہ قیامت کے دکھ اٹھاتے ہیں

ان اشعار کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیے۔ "یتیم" کی بیکسی کا یہ منظر کتنا درد انگیز ہے کہ اسے اندیشہ لگا ہوا ہے کہیں یہ کسی بھی ساتھ نہ چھوڑ دے، ہلال مہینے میں ایک مرتبہ نکلتا ہے، یتیم کہتا ہے یہ بھی شاید روٹی کا ایک کنارہ ہے جو غریبوں اور مفلسوں کو ملتا ہے اور ہلال کی طرح وہ بھی صرف گاہے ماہے۔ دوسرے بند میں وہی باتیں پیش کی ہیں، جن کا تعلق بچوں کے ماحول سے ہے یعنی جن کے والد زندہ ہوں۔ بچے والد کی انگلی پکڑ کر سیر کو جاتے ہیں۔ والد کہیں جانے لگے تو بچہ روئے گا، مجھے بھی ساتھ لے جایئے۔ کھیلتے کھیلتے کہیں چوٹ لگے گی تو والد سے چھپائے گا کہ دیکھ کر خفا نہ ہوں اور کبھی مدرسے میں نہ جا سکے گا تو عموماً والد کو ساتھ لے کر جائے گا کہ اُستاد کی سزا یا پرسش سے محفوظ رہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں انجمن کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس کے لیے اقبال نے اسلامیہ کالج کو مرکز فکر بنایا اور اس پر نظم لکھی چنانچہ اس کا عنوان تھا "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے"۔ دیکھیے اس زمانے میں بھی اقبال کے خیالات تعلیم کے اس عظیم الشان سرچشمے کے متعلق کتنے بلند تھے۔ فرماتے ہیں اور اسلامیہ کالج کی زبان سے فرماتے ہیں:

طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر
آہ وہ دلکش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں

آئیں اڑ اڑ کر پتنگے روم و مصر و شام سے
شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں

آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے میں سنا سکتا ہوں میں

ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں

بلاشبہ آگے چل کر اقبال کے فکر و نظر میں بڑی رفعت اور بڑی بلندی پیدا ہو گئی۔ اس کے معیار بہت اُونچے ہو گئے۔

مگر ۱۹۰۲ء میں بھی جب ان کی معجز نمائی کا ابتدائی دور تھا، وہ یہی امید لیے بیٹھے تھے کہ جس اسلامی درسگاہ کا انتظام پنجاب میں ہؤا ہے، وہ دورِ گذشتہ کے سے اکابر پیدا کرے گی۔ اس شمع پر باہر کے ملکوں سے پروانے اُڑ اُڑ کر آنے لگیں گے تعلیم کے اعجاز سے کام لیا جائے گا تو وہ منظر پھر پیدا ہو جائے گا، جسے آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں مسلمانوں کے دورِ عروج و عظمت میں فرنگستان جس صدا کے لیے گوش بر آواز رہتا تھا اسلامیہ کالج وہی صدا پھر زمانے کو سنا سکے گا اور غرناطہ و بغداد کو جس محفل علم و فضل پر ناز تھا، اس کے دم سے وہ اس دنیا میں دوبارہ جم جائے گی۔

یہ اس دور کے عزائم اور آرزوئیں ہیں، جب یہاں عام طور پر ایسی باتیں حاشیہ خیال میں بھی نہ آتی تھیں۔ ساتھ ساتھ دیکھتے جائیے کہ اقبال اس وقت بھی ہر مسلمان کو محنت و مشقت سعی و کوشش اور جد و جہد کی تعلیم دیتے تھے، جو زندگی کے آخری دور میں ان کا خاص پیغام بن گئی۔ وہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کو دنیا کے لیے وجہ زیب و زینت بنانے کے آرزو مند تھے۔ اور یہ شان جن اوصاف و خصائل سے پیدا ہو سکتی تھی، وہ صرف صحیح اسلامی اوصاف و خصائل تھے۔ فرماتے ہیں:

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ ‏ ‏ ہے وہی اخترجبینِ کہکشاں کے واسطے
زندگی وہ چاہیے، دنیا کی زینت جس سے ہو ‏ ‏ شمع روشن بن کے رہ بزمِ جہاں کے واسطے
گلشنِ عالم میں وہ دلکش نظارہ ڈھونڈنا ‏ ‏ آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے

یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامیِ محنت میں کچھ
جا رہا ہے تو کہاں آرامِ جاں کے واسطے

پھر کہتے ہیں کہ ان مقاصد و عزائم کے لیے جد و جہد درکار ہے محنت و مشقت درکار ہے نصب العین کی طرف انسان کو قدم بڑھانا چاہیے اور اپنے اوپر ہر قسم کی سختیاں، ہر نوع کی تکلیفیں اور ہر رنگ کی جانفشانیاں بے تکلف گوارا کر لینی چاہئیں کیوں؟ اس لیے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے کنواں پیاسے کے پاس کبھی نہیں آتا۔ قافلہ منزل کے لیے رختِ سفر

باندھا ہے، منزل نے قافلے کے لیے رختِ سفر کبھی نہیں باندھا؛

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اُٹھ کر کنواں؟
رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے؟

اس نظم کے آٹھویں بند میں فرماتے ہیں:

بزم میں شوقِ مئے حکمت ہوا پیدا، مگر
مے بھی بٹ جائے گی پہلے فکر پیمانہ تو ہو

درس گاہ کی حیثیت یقیناً پیمانے کی ہے جس شخص کی آرزو ہو کہ حکمت کی شراب محفل میں تقسیم کرے، ظاہر ہے کہ اسے سب سے پہلے ساغر و پیمانہ کا انتظام کرنا چاہیے، اس لیے کہ شراب ساغر و پیمانہ کے بغیر تقسیم نہیں ہو سکتی اور اسے محفل کے ہر لذّت دوست تک پہنچایا نہیں جا سکتا!

یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت | ہاں ذرا ویسا منوّر اپنا کاشانہ تو ہو
یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمھیں، | شان شاہانہ ہو میری امیرانہ تو ہو
وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا | ہاں مگر پہلے روش تیری گدایانہ تو ہو

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل ربایانہ تو ہو

آخری شعر کا جو بنیادی مضمون ہے، اُسے اقبال کے درمیانے اور آخری دَور میں بھی بنیادی حیثیت ہی حاصل رہی مثلاً "تصویرِ درد" میں کہتے ہیں، جو ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی:

شرابِ رُوح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی سکھایا اُس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اسے چھوڑیے، ان کی آخری بڑی نظم "طلوعِ اسلام" کو دیکھیے:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مُسلمانی اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی

محبت سے مقصود محبت داخلی بھی ہے اور محبت خارجی بھی ہے۔ یعنی یہ بھی ضروری ہے کہ مُسلمان آپس میں محبت کے رشتوں سے بندھے ہُوئے ہوں۔ ان کے درمیان، خون، نسل، رنگ اور جغرافیائی تقسیمات کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ وہ فرقہ داری کی تمام کشمکشوں کو ختم کر کے اسلام کے بنیادی قانون محبت و اخوّت کو دنیا بھر میں پھیلا دیں۔ اس لیے فرمایا:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

قرآن مجید کی تعلیم یہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (سورہ حجرات)

اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمھاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس میں پہچان ہو۔ تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی ہے جس کو اَدب بڑا۔

یہ حضرت شیخ الہند مرحوم کا ترجمہ ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:

اکثر غیبت طعن و تشنیع اور عیب جوئی کا منشا کبر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس کو بتلاتے ہیں کہ اصل میں انسان کا بڑا یا چھوٹا یا معزز و حقیر ہونا ذات پات اور خاندان و نسب سے تعلق نہیں

رکھتا بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت، مودب اور پرہیزگار ہو، اسی قدر اللہ کے ہاں معزز و مکرم ہے۔ نسب کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری سب کا سلسلہ آدم و حوا پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ ذاتیں اور خاندان اللہ تعالیٰ نے محض تعارف اور شناخت کے لیے مقرر کیے ہیں۔۔۔۔ مجد و شرف اور فضیلت و عزت کا اصلی معیار نسب نہیں، تقویٰ اور طہارت ہے۔

اس مضمون کے ارشادات خود حضور رحمۃ للعالمین صلعم سے منقول ہیں۔ مثلاً فتح مکّہ کے موقع پر فرمایا کہ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، غربی کو شرقی پر اور شرقی کو غربی پر کوئی فوقیت نہیں مگر صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

بہ ظاہر اس ارشاد کی اہمیت کا احساس شاید عام طور پر نہ کیا جائے لیکن اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اسلام کے ان حقائق میں سے ہے، جسے کائنات انسانیت میں بلند انقلابی حیثیت حاصل ہے۔ یقیناً انسانیت میں ایسے انقلاب بہت کم آئے۔

یہ کسے معلوم نہیں کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور کون ہے جو ایک باپ کی اولاد میں صرف نسل اور خون کی بنا پر امتیازات کو معقول قرار دے؛ پھر رنگ یا خط و خال یا وطن کا معاملہ اتفاقات پر موقوف ہے۔ کسی کو رزق و معاش کی ضرورتیں کہیں لے گئیں، کسی کو کہیں لے گئیں۔ رنگ اور خط و خال کا معاملہ عموماً ماحول پر مبنی ہوتا ہے۔ جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے، وہاں کے باشندے زیادہ تر سرخ و سفید ہوتے ہیں۔ جہاں سورج کی حدّت زیادہ ہوتی ہے، وہاں جو لوگ رہتے ہیں اُن کے رنگ کالے ہوتے ہیں۔ معتدل خطوں میں بسنے والے اصحاب کے رنگ نہ زیادہ سیاہ ہوتے ہیں نہ زیادہ سُرخ و سفید بلکہ عموماً سانولے ہوتے ہیں۔ پھر کسی نے کھیتی باڑی شروع کر دی، کسی نے تجارت کو پیشہ بنا لیا۔ کسی کو ملازمت راس آئی، کوئی ریوڑ چرانے لگا۔ بعض دولت مند بن گئے اور انھوں نے بڑی بڑی جائدادیں پیدا کر لیں۔ بعض غریب رہے اور اُن کی زندگی پریشاں حالی

میں بسر ہوتی رہی۔ بایں ہمہ دُنیا نے رنگ نسل، دولت، وطن یا اس قسم کے دُوسرے اتفاقی معاملات کو شرافت، عزت، برتری اور بلندی کے معیار بنا لیا۔ اقبالؔ نے اسی حالت سے متاثر ہو کر "خفتگان خاک سے استفسار" میں کہا تھا کہ اس دُنیا میں تو حکومتوں کی حیثیت بلبلے سے زیادہ نہیں، اور دولت ہی کو شرافت کا معیار قرار دیتے ہیں کیا دوسری دُنیا میں جس جہاں تم پہنچے ہو یہی کیفیت ہے؛

وہاں کی عزت بھی حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؛

واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؛

اسلام نے اس دُنیا میں سب سے پہلے یہ صدا بلند کی کہ شرافت، نیکی، عزت اور حسن و خوبی کا معیار تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔ دولت، رنگ، نسل، خون وغیرہ سب چیزیں بے حقیقت ہیں۔ یہ معمولی بات نہ تھی بلکہ انسان کی توجہ ہر مادی چیز سے ہٹا دی اور صرف حسن عمل، فضائل اخلاق، خُوبیِ روش اور نیکی کو حقیقی نصب العین بنا دیا۔ گویا جد و جہد کی جائے تو اس راہ میں کہ نیکی اور حسن عمل کی زیادہ دولت کون فراہم کرتا ہے۔ نہ یہ کہ سونے اور چاندی کے ڈھیر کس کے پاس زیادہ جمع ہوتے ہیں؛ رنگ کس کا گورا یا سفید ہے؛ املاک کس کے پاس زیادہ ہیں؛ رُوپے کے بل پر زیادہ آدمیوں کو کون اپنے ارد گرد جمع کر لیتا ہے؛

اقبالؔ نے داخلی محبت کو مسلمانوں کا ایک اہم نصب العین قرار دیا یعنی یہ کہ وطن، رنگ، نسل وغیرہ کو نہ دیکھیں بلکہ سب جذبۂ محبت سے ایک دُوسرے میں پیوست ہو کر ایک مِلّت بن جائیں، پھر یہی پیغام محبت دنیا کو پہنچائیں۔ فرمایا:

عمل پیہم، یقین محکم، محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مُسلمان کی زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ کیا ہے؛ اللہ اور رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرمائے ہُوئے فضائل کو مسلک بنا کر مسلسل و پیہم عمل، اس عمل کے نتائج حسنہ کے بارے میں پختہ یقین اور انسانوں کے ساتھ برتاؤ میں محبت، جو دنیا کو مسخر کر لے۔ یہ شمشیریں اور یہ تلواریں ہیں، جن سے مردانِ حق جہادِ زندگی میں کام لیتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے میں کسی کو دقّت پیش

نہیں آسکتی کہ اگر انسانوں کے دل میں اُترنا ہے تو لازم ہے کہ ان کے ساتھ محبت، ہمدردی، خیرخواہی اور خیرسگالی کا برتاؤ کیا جائے۔ بے شک بعض اوقات مصیبت خیز فتنوں کے انسداد کے لیے قوت سے کام لینا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی انسان بیمار ہو جائے تو اس کے لیے علاج کی مختلف تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں مثلاً کبھی منضج پلایا جاتا ہے اور جلاب دیا جاتا ہے کہ تنقیہ ہو جائے۔ فصد لی جاتی ہے کہ فاسد خون نکل جائے۔ مگر صحت و قوت کی بحالی بلکہ اس میں اضافے کی طبعی تدبیر یہی ہے کہ اچھی، زود ہضم اور جزوِ بدن بننے والی غذاؤں کا انتظام کیا جائے۔ ہر انسان کو یقین دلایا جائے کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ سراپا ہمدردی، نیکی اور خیرسگالی پر مبنی ہے۔

محبت کا یہی پیغام تھا جو صدرِ اوّل کے عرب لے کر اپنے وطن سے باہر نکلے اور بہت ہی تھوڑی مدت میں شرق و غرب کے عالیشان ایوان ان کی ناموری کے آوازے سے گونجنے لگے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے تبلیغ اسلام کا کوئی خاص اہتمام کیا تھا؟ مگر جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے، پوری آبادیاں دینِ حق کی حلقہ بگوش بن گئیں۔ بلکہ عربی کو انھوں نے مادری زبان کے طور پر اختیار کر لیا۔ یہ سب اس محبّت کے کرشمے تھے جسے اقبالؔ نے فاتحِ عالم قرار دیا۔

آج عرب سے مغربِ اقصیٰ تک کیا کیفیت ہے؟ کیا حجاز سے کہیں بڑھ کر بیروت و شام و مصر عربی زبان کے مایہ ناز مرکز نہیں؟ کیا خلیج فارس سے اوقیانوس تک بہ اختلاف لب و لہجہ عربی زبان نہیں بولی جاتی اور ان کی اساس فخرِ اسلام کے سوا بھی کچھ ہے؟ کیا ایران، ترکستان، افغانستان، بلوچستان، سندھ میں آپ کو کوئی ایسی پیچیدگی نظر آئی جیسی پنجاب، دہلی، یوپی یا پاک و ہند کے دوسرے حصّوں میں ہمارے سامنے پیدا ہوئی؟ اس لیے کہ یہاں اسلام عربوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ عجمیوں کے ذریعے سے پہنچا تھا۔ کور ذوقوں نے حقائق کا صحیح اندازہ نہ کیا، مگر کیا ملّتِ اسلامیہ کے لیے یہ انتہائی فخر کا سامان نہیں کہ اس کے عظیم القدر محدث، عظیم القدر فقیہہ، عظیم القدر لغت نگار،

عظیم القدر فلسفی بڑی تعداد میں عجمی تھے، جنہوں نے عربی زبان کے دامن کو گوناگوں علوم کے جواہر ریزوں کا گنجینہ بنا دیا، اس لیے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد عربی ان کی مایہ ناز علمی زبان بن گئی تھی۔ وہ آپس میں بات چیت کے لیے خواہ کوئی زبان استعمال کرتے ہوں، مگر سوچتے تھے تو قرآن کی زبان میں، لکھتے تھے تو قرآن کی زبان میں، خطبے دیتے تھے تو قرآن کی زبان میں۔ یہ عربوں کی شان محبت کے کرشمے تھے جو جگہ جگہ ایسی شکل میں نمایاں ہوئے کہ اُن کی کوئی نظیر شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے۔

یہ آپ کے سامنے انگریزی اقتدار کی داستان کے تمام اوراق کھُلے پڑے ہیں: جو ابھی چند سال پیشتر تک دنیا کا بہت بڑا اقتدار تھا اور جو ابتدائی ظہور سے کم از کم تین چار سو سال تک خاصا پایدار رہا۔ انگریزی زبان نے نئے ملک پیدا کر لیے۔ لیکن کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں سے اس زبان کے لیے ویسے عظیم الشان کام کا عشرِ عشیر بھی انجام پایا، جو عجمیوں نے عربی زبان کے لیے انجام دیا؟

غرض دنیا کو تلوار سے نہیں، شمشیر زنی سے نہیں، کشور کشائی سے نہیں، دولت و ثروت سے نہیں، صرف محبت اور خیر خواہی سے راہِ حق پر لایا جا سکتا ہے اور صرف محبت و خیر خواہی سے سب کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر جھکائی جا سکتی ہے۔ اقبال کی طرف سے ابتدا میں بھی یہی پیغام تھا اور آخر میں بھی یہی پیغام تھا۔ اگر آخر میں کہا:

عمل پیہم، یقیں محکم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تو ابتدا میں بھی اقبال کی زبان پر یہی پیغام تھا:

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل ربایانہ تو ہو

یہی وجہ ہے اقبالؔ نے "اسرارِ خودی" میں ایک مستقل عنوان باندھا کہ "خودی از عشق و محبت استحکام مے پذیرد"۔ مسلمان کے عشق کا مرکز حضور رحمۃ للعالمین صلعم کی ذات بابرکات ہے حضورؐ کی شان جمالی مسلمانوں کے لیے زندگی کی تاریک راہوں میں عمل کی تجلّی زار ہے۔

اب میں صرف ایک نکتے کی طرف چند اشارے کروں گا اور اس مقدمے کو ختم کر دوں گا اور وہ یہ کہ اقبالؔ کے جن افکار و مضامین کو دَورِ آخر میں ان کی عظمت کا خاص معیار قرار دیا گیا، وہ ابتدائی دور میں بھی موجود تھے، اگرچہ حسنِ اظہار و لطفِ بیان کی وہ شان نہ تھی جو آخری دَور کے لیے وجہ امتیاز بنی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

دورِ کمال کی ایک غزل ہے جس میں فرماتے ہیں:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہے عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق، — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لیکن دیکھیے ابتدائی دَور کی ایک غزل میں بھی یہ مضمون موجود ہے:

عقل کی فوج نے ہر جنگ میں منہ کی کھائی — عشق میدان میں آیا تو ظفریاب ہؤا

ایک مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو سعی و کوشش اور جدوجہد کی تعلیم دی۔ گویا ان کا کلام "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کی ایک نہایت دل پذیر تفسیر ہے۔ وہ سکون کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس کی مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

"پیامِ مشرق" میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ساحل افتادہ گفت، گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شُد، آہ کہ من چیستم

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت   ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم

اور "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" تو اعادے کا محتاج ہی نہیں۔

دیکھیے ابتدائی دَور میں بھی اس قسم کے مضامین جا بجا ملتے ہیں مثلاً:

کر نہ تقدیر کے شکوؤں سے خودی کو رسوا   بہرِ تدبیر عیاں عالمِ اسباب ہوا

ضربِ شمشیرِ حوادث میں نہ کھو قوتِ ضبط   سخت خود دار ہو دنیا میں سپر کی صورت
دہر میں ذوقِ فنا تجھ کو ہے پیغامِ فنا   تازہ رکھ جوششِ سفر شمس و قمر کی صورت

خودی اقبال کا خاص مضمون ہے۔ اس کی جھلک ابتدائی دَور کے اشعار میں بھی ملتی ہے:

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی   ترا حسن دائم مرے روبرو ہے

نہ ہو جب تلک دل میں ایمان کامل   خودی بھی فسانہ خدا بھی فسانہ

خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے   غریبی میں انداز ہیں خسروانہ

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں   جنتی ہوگا، فرشتوں میں نمایاں ہوگا

قلبِ انساں سے چلی آتی ہے فطرت کی صدا   خود کو جو جان گیا سمجھو، خدا یاب

فقیری، قلندری، توکل اور خدا کے سوا ہر شے سے بے نیازی اقبال کے وہ اوصاف ہیں، جو آخری دَور کی طرح پہلے دَور میں بھی ممتاز تھے۔

کون جانے کہ قلندر ہے شہنشاہِ عشق   فرشِ خاکی بھی مجھے بسترِ کمخواب ہوا
ہر ضرورت ہوئی پوری تو خدا سے اقبال   میں نہ تکلیف میں شرمندۂ احباب ہوا

وہ دنیا کو شگفتہ اور خوشحال و خوش باش دیکھنے کے آرزومند تھے۔ فرماتے ہیں:

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام یہ اسی باغ میں کر بادِ سحر کی صورت

آخری دَور کا ایک نہایت مشہور شعر یہ ہے :-

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یہ وفات سے بہت تھوڑی مدت پیشتر کہا گیا تھا، لیکن یہ مضمون ابتدائی دور کے ایک شعر میں بھی موجود ہے،

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے موت جب آئے گی اُس کو تو وہ خنداں ہوگا

شمع اور شاعر میں ایک جگہ مسلمان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے :

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اس قسم کی صدائیں ابتدائی دور میں بھی سنی جا سکتی ہیں۔ مثلاً :

تری ہستی ہی پہ موقوف ہے نظمِ عالم دستِ قدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے تو
ہو یقین مُردہ تو ہے سنگ بھی تجھ سے بہتر ہو یقین زندہ تو پھر حیدرِ کرّار ہے تو

غرض ان اشعار کو محفوظ کر دینا میرے نزدیک حد درجہ ضروری تھا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس طرح اقبال کے دل و دماغ کی ارتقائی منزلوں کا اندازہ کرنے کے لیے مزید سامان مہیا ہو سکتا ہے۔ نیز اس لیے کہ جو کچھ آخری دَور میں بہتر، پختہ تر اور دل آویز تر انداز میں کہا گیا، وہی ابتدائی دَور میں بھی کہا گیا۔

اپنی بساط کی حد تک ترتیب کو زیادہ سے زیادہ مفید و نفع بخش بنانے کی کوشش کی۔ جا بجا حواشی لکھے۔ اکثر نظموں کے آغاز میں تمہیدوں کے ذریعے سے پس منظر واضح کیے، جو کلامِ اقبال کے مطالعے میں یقیناً معاون ہوں گے، نیز نظموں کی تاریخی حیثیت بھی اس طرح محفوظ ہو جائے گی۔ بعض اصحاب نے غالباً عجلت میں بعض ایسی نظمیں اقبال سے منسوب کر دیں، جو حقیقتہً ان کی نہ تھیں، مثلاً "مدینہ کے ایک کبوتر کی یاد میں"۔ یہ نظم

مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی تھی اور ۲۴- نومبر ۱۹۱۷ء کے روزنامہ "ستارہ صبح" میں شائع ہو چکی تھی، اس کے آغاز میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا:

جسے (کبوتر کو)، علامہ اقبال کے ارادت کیش ہاتھوں نے پالا تھا
مگر ۲۰- نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک بلّی کا شکار ہو گیا۔

نظر بہ ظاہر مولانا کو کبوتر کے مارے جانے کا علم ہوا تو انھوں نے بے تکلف نظم کہہ کر شائع کر دی۔ چونکہ کبوتر اقبال کا پالا ہوا تھا اس وجہ سے بعض اصحاب نے سمجھا کہ اصل نظم بھی اقبال ہی کی ہو گی، حالانکہ اس کے آٹھ شعروں میں ایک بھی نہیں جس میں اقبال کے انداز کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہو اور واضح رہے کہ یہ نظم ابتدائی دور کی نہ تھی بلکہ ۱۹۱۷ء کے اواخر کی تھی، جب اقبال فکر و نظر کے اعتبار سے بلوغ کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔

اقبال کے سلسلے میں بہت سے گراں قدر کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مہلت اور توفیق مرحمت فرمائے تو وہ ضرور انجام پانے چاہئیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم اور ضروری کام ان کی سیرت کا بھی ہے۔ اس میں جو کچھ ہونا چاہیے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر ظاہر ہے مقصود یہ نہیں کہ ان کی زندگی کے بعض معروف و غیر معروف واقعات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر دیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب مرتب ہو جائے، جس میں ایک طرف اس مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ دوسری طرف اس کے کلام کی تمام ارتقائی منزلیں واضح طور پر معین ہو جائیں تاکہ اسے پڑھ کر اقبال کا مطالعہ کرنے کے شائقین کتابیں دیکھنا شروع کریں تو ان کے ذہنوں میں شخصیت کا روشن و معین تصور موجود ہو اور وہ کتاب اس سفر کے لیے شدِّ رحال کرنے والوں کو زادِ راہ کا کام دے سکے۔ اب تک اپنے علم و ہنر کی بے مایگی دامن کش رہی، لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اگر سالہا سال اس دریائے فضائل و مکارم کے کنارے گزار چکنے کے بعد استفادہ و استفاضہ کا اتنا حق بھی ادا نہ ہو سکا تو یہ مجرمانہ کوتاہی ہو گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ حق ادا کرنے اور یہ فرض بجا لانے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔

اقبال کی تحریر و تصحیح کے چند نمونے

آیندہ سات صفحات میں حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے قلم سے مختلف نمونے پیش کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱- "رموزِ بے خودی" کی طبعِ ثانی سے پیشتر مرحوم نے بہت سی ترمیمات فرمائی تھیں یہ مکمل ترمیم شدہ نسخہ شیخ مبارک علی تاجرِ شہیر کتب کے پاس محفوظ ہے اس میں سے تین مختلف صفحوں کے عکس دیے گئے ہیں۔

ایک نظم جو بانگِ درا میں چھپ چکی ہے اس کا آخری شعر پہلے ایک انداز میں تھا، اُسے اشاعت کے لیے بھیج چکنے کے بعد اس میں ترمیم کا خیال آیا۔ چنانچہ اشاعت سے پیشتر آخری شعر بدل دیا گیا۔ ان دونوں کا عکس ایک صفحے پر موجود ہے۔ اسے بھی اصلاح ہی کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیے۔

۳- علامہ مرحوم کی دو نظموں کا عکس جن میں سے ایک بانگِ درا میں چھپ چکی ہے (ص ۲۳۳)، دُوسری نہیں چھپی۔

۴- جو فارسی نظم کتاب کے صفحہ پر درج ہے اس کا اصل خود حضرت علامہ مرحوم کے قلم سے۔

۵- ٹیپو سُلطان شہید کے متعلق علامہ مرحُوم کے پانچ شعر خُود ان کے قلم سے۔

گرچہ مثلِ بو سراپایش رم است	چون وطن در سینۂ گیرد دم است
آتشِ او دم بخویش اندر کشد	لالہ گردد ز شاخے بر دمد
رشتہ ہائے خویش را بر خود تند	ہمچو گردد گرہ بر خود زند
در گرہ چون دانہ دارد برگ و بر	چشم بر خود وا کند گردد شجر
خلعتے از آب و گل پیدا کند	دست و پا و چشم و دل پیدا کند

خلوت اندر تن گزیند زندگی

انجمن ہا آفریند زندگی

ہمچنان آئینِ میلادِ اُمم	زندگی بر مرکزے آید بہم

رموزِ بے خودی: جمعیتِ ملیہ مرکزِ محسوس می خواہد

در معنیِ این کہ حیاتِ ملّیہ مرکزِ ~~مشہود~~ محسوس می خواہد و مرکزِ ملّتِ اسلامیّہ بیت الحرام است

می کشایم عقدہ از کارِ حیات
سازمت آگاہِ اسرارِ حیات

چون خیال از خود رمیدن پیشہ‌اش
از جہت آمن کشیدن پیشہ‌اش

در جہانِ پرریز دو آید چسان؟
وقتِ او فردا و دی زاید چسان؟

تا نماید تابِ نامشہودِ خویش
شعلۂ او جلب بند از دودِ خویش

سیرِ او را تا سکون بندد نظر
موجِ جوشش بستہ گردد در گہر

رموزِ بے خودی: حیاتِ ملیہ مرکزِ محسوس می خواہد

حرزِ جاں کُن گفتۂ خیرالبشر ~~~ هست شیطان از جماعت دور تر

~~فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند ~~~ هم نیال و هم نشین و همسر اند~~

فرد می گیرد ز ملت احترام ~~~ ملت از افراد می یابد نظام

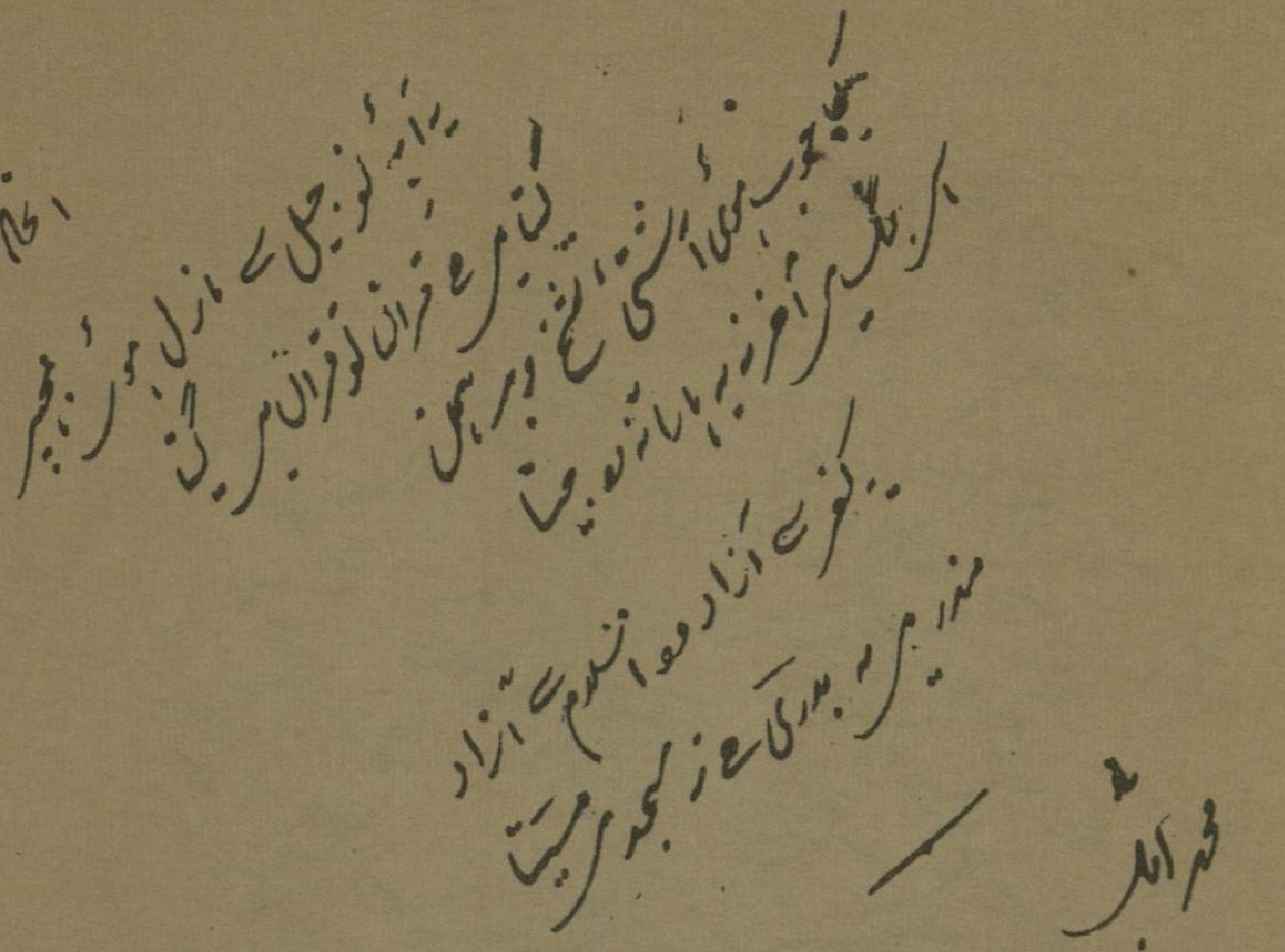
فرد تا اندر جماعت گم شود ~~~ قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

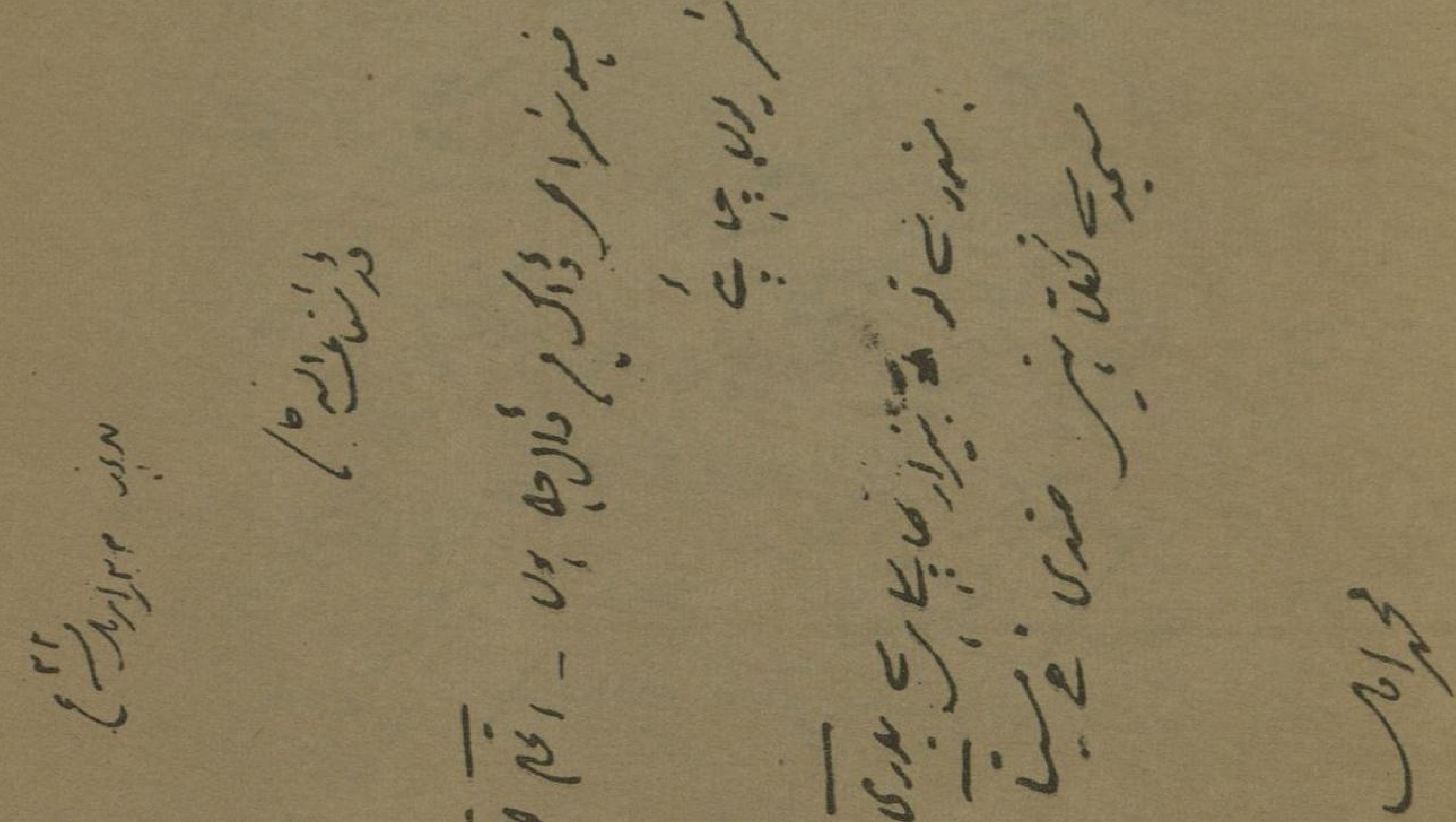
مایه دارِ سیرتِ دیرینۂ او ~~~ رفته و آینده را آئینۂ او

وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او ~~~ چون ابد لا انتها اوقاتِ او

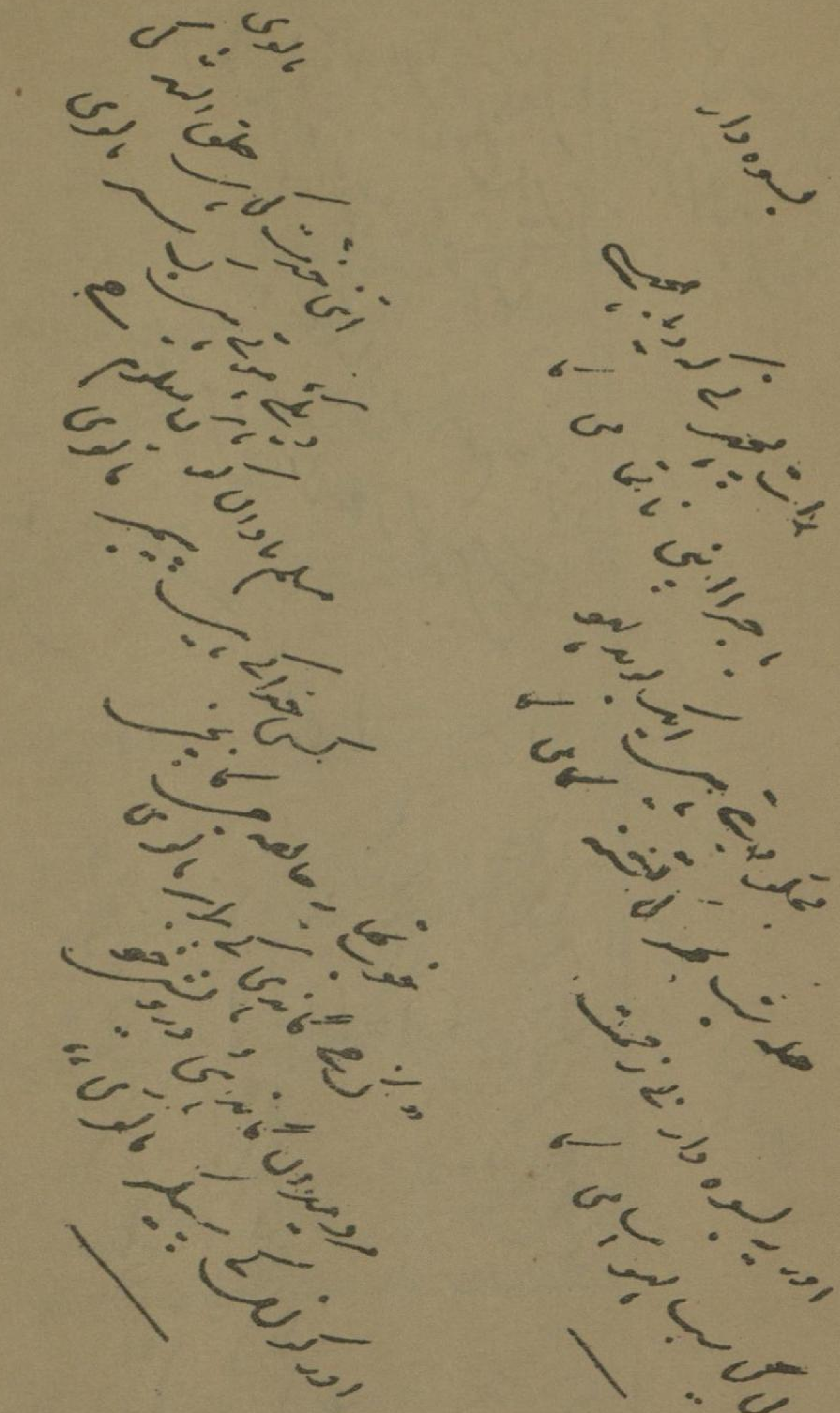
در دلش ذوقِ نمو از ملت است ~~~ احتساب کارِ او از ملت است

پیکرش از قوم و هم جانش ز قوم ~~~ ظاهرش از قوم و پنهانش ز قوم





۱؎ یہ نظم "بانگِ درا" ص۳۲۳ پر موجود ہے۔ اس کا آخری شعر پہلے اور تھا، پھر اسے بدل دیا۔ جیسا کہ عکسِ بالا سے واضح ہے۔


بسوہ دار

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL, M. L. C.
BARRISTER-AT-LAW
LAHORE.

[illegible]

فطرت تو مستنیر از مصطفی است
باز گو آخر مقام ما کجاست

[illegible]

محمد اقبال بیرسٹر [illegible] لاہور [illegible]

سرود رفتہ صفحہ ۴۶ کا اصل

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL M. L. C.
BARRISTER-AT-LAW
LAHORE.

[illegible]

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است

ٹیپو سلطان شہیدؒ

نالۂ یتیم

یہ پہلی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۳، ۲۴، ۲۵ فروری ۱۹۰۰ء) میں پڑھی اور جس سے ان کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ نظم ۲۴ فروری کے تیسرے اجلاس میں بعد نمازِ عصر پڑھی گئی تھی۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد خاں اس اجلاس کے صدر تھے۔ انجمن کی رُوداد مظہر ہے:

"شیخ محمد اقبال صاحب نے "نالۂ یتیم" جو چھپا ہُوا تھا، پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ہر ایک شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سیکڑوں آنکھیں تھیں جو دریائے اشک بہا رہی تھیں۔ اِس کے پڑھنے کے دَوران میں تین سو روپے سے کچھ اُوپر نقد چندہ ہو گیا اور کل کاپیاں اس نظم کی اسی وقت فروخت ہو گئیں۔ نظم ایسی مقبول ہُوئی کہ چار چار روپے کو بھی ایک ایک کاپی بکی۔

(رودادِ انجمن بابت ۱۹۰۰ء صفحہ ۳۰، ۳۱)

مولانا نذیر احمد خاں شاعروں کی حوصلہ افزائی کے عادی نہ تھے، لیکن نظم سُن چکنے کے بعد انھوں نے فرمایا:

"میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سُنی ہیں، مگر واقعی ایسی دلخراش نظم کبھی نہیں سُنی" (رُوداد صفحہ ۳۶)

واضح رہے کہ یہ نظم یتیم کی زبان سے ادا ہُوئی ہے، جیسا کہ اس کے نام "نالۂ یتیم" سے ظاہر ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ نظم اگرچہ فارسی تراکیب سے لبریز ہے اور عام لوگ اسے آسانی سے نہیں سمجھ سکتے، تاہم خیالات کی ندرت اور حُسنِ بیان کے اعتبار سے یہ حد درجہ پسند کی گئی۔ سچ یہ ہے کہ یتیم کی داستانِ درد اس سے پہلے کسی نے ایسے پُر تاثیر انداز میں بیان نہ کی تھی۔

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں ایسا دِل نہیں   بُجھ گئی جب شمعِ روشن، درخورِ محفل نہیں
اے مصافِ نظمِ ہستی! میں ترے قابل نہیں   نا اُمیدی جس کو طے کر لے یہ وہ منزل نہیں

ہائے کس منہ سے شریکِ بزمِ میخانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہو جائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرت غیرتِ نوکِ سناں ہونے لگا   یوسفِ غم زینتِ بازارِ جاں ہونے لگا
دلِ مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا   نالۂ دِل رُوشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ سرائی رشکِ صد فریاد ہو
جو سرودِ عندلیبِ گلشنِ برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا، چاکِ گریباں کے لیے   اشکِ غم ڈھلنے لگے، پا بوسِ داماں کے لیے
مضطرب ہے اب دِلِ نالاں بیاباں کے لیے   جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لیے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر
روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرت دلِ خو کردۂ حسرت نہیں   در خورِ بزمِ طرب شمعِ سرِ تربت نہیں
زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں   غیرِ حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے
ہستیِ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیامِ بحرِ ہستی جزر و مدِ امید کا   گاہے گاہے آنکلتی ہے مسرّت کی ہَوا
زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا   لے کے طوفانِ ستم ابرِ تغیّر آگیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل، کوئی ناکام ہے

اِس نظارے کا مگر خاکِ لحد انجام ہے

اے فلک تجھ سے تمنائے سعادت پروری؟ ہر ستارہ ہے ترا داغِ دلِ نیک اختری
تو نے رکھا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری؟ "اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری"

"دوستی از کس نمے بینیم یاراں را چہ شد
دوستی کو آخر آمد دوستداراں را چہ شد"

نطق کر سکتا نہیں کیفیتِ غم کو عیاں اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں
آ نہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ نہاں

عجزِ گویائی ہے گویا حکمِ قیدِ خامشی
مجرمِ اظہارِ غم کو یہ سزا ملنے لگی

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے
ظلِّ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے ہاں ڈبو دے اے محیطِ دیدۂ پُرنم مجھے

مضطرب اے دل! نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لیے
تُو بنا ہے تلخیِ اشکِ یتیمی کے لیے

سایۂ رحمت ہے تُو اے ظلِّ دامانِ پدر غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گزر
رہنما ہے وادیِ عالم میں تو مثلِ خضرؑ تُو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سر بسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہُما تاثیر ہے[1]
تُو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اگر بچے کو بادشاہ فرض کریں تو اُس بادشاہ کے لیے باپ کے دامن کا سایہ ہُما کا اثر رکھتا ہے۔

عینِ طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی ۔۔۔ صبحِ پیری کی مگر بن کر یتیمی آ گئی
بادِ ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی ۔۔۔ شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر! جولانی تری ۔۔۔ اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری
کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطانی تری ۔۔۔ اور شعاعِ مہر سے خنداں ہے پیشانی تری

نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بیکسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بیکسی

کھینچ سکتا ہے مصوّر خندۂ گل کا سماں ۔۔۔ اور کچھ مشکل نہیں اے برق! تیری شوخیاں
صبح کا اختر نہیں کلکِ تصوّر پر گراں ۔۔۔ اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسّم کے نشاں

یہ تبسّم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے
دردِ پنہاں کو چھپانے کے لیے اِک پردہ ہے

یادِ ایّامِ سلف! تُو نے مجھے تڑپا دیا ۔۔۔ آہ اے چشمِ تصوّر! تُو نے کیا دکھلا دیا
اے فراقِ رفتگاں! تُو نے یہ کیا سمجھا دیا ۔۔۔ دردِ پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا

رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمدِ بُوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم ۔۔۔ ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذّتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبحدم یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کا زیر و بم[1]
رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتے نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتے نہیں

ہر گھڑی اے دل! نہ یُوں اشکوں کا دریا چاہیے داستاں جیسی ہو، ویسا سُننے والا چاہیے
ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہیے آستاں اس کو یتیمِ ہاشمیؐ کا چاہیے
چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے
سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار[2] ہے

اے مددگارِ غریباں! اے پناہِ بیکساں! اے نصیرِ عاجزاں! اے مایۂ بے مایگاں
کارواں صبر و تحمّل کا ہوا دل سے رواں کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں
ہے تری ذاتِ مبارک حلِ مشکل کے لیے
نام ہے تیرا اشفا دُکھے ہوئے دل کے لیے

بیکسوں میں تابِ جورِ آسماں ہوتی نہیں ان دِلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں
کون وہ آفت ہے جو رہنِ بیاں ہوتی نہیں اِک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں[3]

---

[1] یعنی کسی ایسے باغ سے نسیم آئے جو ارم کے لیے بھی باعثِ رشک ہو اور وہ ایسے انداز سے آئے کہ آمد کی آہٹ کسی کان تک نہ پہنچے یا صبح کے سُورج کی کرن کا رقص ہو یا مرغِ سحر کے نغموں کا دلکش اتار چڑھاؤ ہو، ان میں سے کوئی بھی چیز قبر میں سونے والوں کو نہیں جگا سکتی۔

[2] یہاں سے یتیم حضرت رسولِ اکرم صلعم کی بارگاہ میں فریادی بن گیا ہے۔

[3] مراد یہ ہے کہ ہر آفت کا حال بیان کیا جا سکتا ہے لیکن یتیمی کی دکھ بھری داستان سنائی نہیں جا سکتی۔

میری صورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی
ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی

بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تُو
بہرِ انساں جبرئیلِ آیۂ رحمت ہے تُو

اے دیارِ علم و حکمت، قبلۂ امت ہے تُو
اے ضیائے چشمِ ایماں! زیبِ ہر مدحت ہے تُو

درد جو انساں کا تھا تیرے ہی پہلو سے اٹھا
قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اٹھا

آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبت کا ہے تُو
جس کے ہر قطرے میں سو موتی ہوں وہ دریا ہے تُو

طُور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تُو
معنیِ یٰسیں ہے تُو مفہومِ اَوْ اَدنیٰ ہے تُو

اُس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُر انوار کو
جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

دلربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تُو
مثلِ آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تُو

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تُو
از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تُو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تُو ہوا
تھی مؤخر گرچہ آمد، پر مقدم تُو ہوا

تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے
فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نمناک ہے

تیرے سایے سے منور دیدۂ افلاک ہے
کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے

تو ظہورِ لن ترانی گو سے اوجِ طور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درَو[1] دہقان پر
ہے پسینے سے نمایاں مہرِ تاباں کا اثر
جھلکیاں امید کی آتی ہیں چہرے پر نظر
کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

"یا محمدؐ" کہہ کے اٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکیں اسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دینِ حق، وہ دامنِ غارِ حرا
جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہُوا
وہ حصارِ عافیت، وہ سلسلہ فاران کا
جس کے ہر ذرّے سے اُٹھی دینِ کامل کی صدا

فخرِ پابوسی سے تیری آسماں سا ہوگئی
یہ زمیں ہم پایۂ عرشِ معلّٰے ہوگئی[2]

نظمِ قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا
آ گرا ہوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیے بدلہ مری افتاد کا

آ نہ سکتا تھا زباں تک بیکسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم ذرا بیتابیِ دل کیا صدا آتی ہے یہ
لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
رُوح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ

---

[1] فصل کاٹنے کے وقت۔ [2] واضح رہے کہ نعت کے تمام مضامین بالکل انوکھے اور اچھوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بعض باتوں سے کسی کو اختلاف ہو مگر اس سے پیشتر ایسی نعت کی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ اقبال کا اس وقت کا کلام ہے جب انکی پرعظمت شاعری کی صبحِ اول نمودار ہوئی تھی۔

ہاں ادب اے دل! بڑھا اعزاز مشتِ خاک کا
میں مخاطب ہوں جنابِ سیدِ لولاک کا[1]

"اے گرفتارِ یتیمی! اے اسیرِ قیدِ غم
تجھ سے ہے آرامِ جانِ سرورِ خیر الامم
ناامیدی نے کیے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم
چیرتا ہے دل کو تیرا نالۂ دردِ الم

تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لیے بجلی ترا افسانہ ہے
دل نہیں پہلو میں تیرے غم کا عشرت خانہ ہے
جس پہ بربادی ہو صدقے، وہ ترا ویرانہ ہے
سہم جائے جس سے فرحت، وہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرشِ معظم بھی تری فریاد سے

خون رلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے؟
کیوں نظر آتا ہے تو مثلِ تنِ بے جاں مجھے؟

میری امت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں؟
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں؟

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں
میری امت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحانِ صدق و ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں
ہم مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

---

[1] یہاں سے حضور سیدِ لولاک صلعم کا خطاب مبارک یتیم کے نام شروع ہوتا ہے۔

یہ دل و جان سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر، یہ وہ انسان ہیں[1]

انجمن لاہور میں اک حامیِ اسلام ہے   آسماں پر جس کا پیمانِ محبت نام ہے
جس کی ہر تدبیر تسکینِ دلِ ناکام ہے   جس کا نظارہ مرادِ چشمِ خاص و عام ہے
جمع ہیں عاشق مرے سب ہند اور پنجاب کے
تو وہاں جا کر مری اُمت کو یہ پیغام دے

جا کے یوں کہنا کہ "اے گلہائے باغِ مصطفٰے   تم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہوا
عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصولِ مدعا   رشکِ صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا
یہ وہ جادو ہے کہ جس سے دیوِ حرماں دُور ہو
یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے دردِ عصیاں دُور ہو

یہ دعا میدانِ محشر میں بڑے کام آئے گی   شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی
آتشِ عشقِ الٰہی سے تمہیں گرمائے گی   جو نہ موسیٰؑ نے بھی دیکھا تھا تمہیں دکھلائے گی
جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگِ ہمت کو لانا چاہیے   احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیے
بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیے   مل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیے

---

[1] ان دو بندوں میں مسلمانوں کو کس پُر تاثیر انداز میں یتیموں کی امداد پر متوجہ کیا گیا ہے۔

کام بے دولت ترِ چرخِ کہن چلتا نہیں
نخلِ مقصد غیرِ آبِ زر کبھی پھلتا نہیں

صیدِ شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اور ہے — نوک جس کی دل میں چبھتی ہو وہ کانٹا اور ہے
علتِ حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے — دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے
پھونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ
نسخۂ مہر و محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی — پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی
کہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی — ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی
تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہات ہے"

یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

یہ دوسری نظم ہے جو اقبالؔ نے انجمن حمایت اسلام کے سولھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۰۱ء) میں پڑھی تھی۔ یہ نظم بھی چھپوا کر لائے تھے۔

بندِ اوّل

اے مہِ عید! بے حجاب ہے تُو — حُسنِ خورشید کا جواب ہے تُو
اے گریبانِ جامۂ شبِ عید — شاہدِ عیش کا شباب ہے تُو

اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور　　نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اے جوابِ خطِ جبینِ نیاز　　طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہالے اے حلقۂ پرِ طاؤس　　قابلِ "ذالک الکتاب" ہے تو
فوجِ اسلام کا نشاں تو ہے　　چشمِ نصرت کا انتخاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا　　کہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو
طوفِ منزل گہِ زمیں کے لیے　　ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھُپنا　　روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے[1]

بند دوم

مقصدِ دیدۂ اُمید ہے کل　　گوہرِ عیش کی خرید ہے کل
دیدۂ مہرِ عالم آرا میں　　سُرمۂ عید کی کشید ہے کل
گلشنِ نو بہارِ ہستی میں　　سبزۂ عیش کی دمید ہے کل
کحلِ محرابِ ہر جبینِ نیاز　　زینت افزائے عینِ عید ہے کل
اے مہِ نو! ترا پیامِ طرب　　ہے شنید آج چشم دید ہے کل

---

[1] اس بند میں ہلالِ عید کی تشبیہیں نظم کی گئی ہیں یعنی گریبان جامۂ عید، نشان رکوع سورۂ نور، جبینِ نیاز کے خط کا جواب، حلقہ پر طاؤس، فوج اسلام کا نشان، پا در رکاب، روشنی کا حباب، کمند غزال شادی۔

اے نسیمِ نشاطِ روحانی — باغِ دل میں تری وزید ہے کل
ہے یہی نغمۂ لبِ طفلی — ہاتھ لانا اِدھر کہ عید ہے کل
کمسنوں کو یہ کہہ رہا ہے ہلال — لو میاں شب بخیر عید ہے کل
سرِ بالیں لباسِ طفلی ہے — میری عُریاں تنی کی عید ہے کل

اے مہِ نَو! خوشی ہو کیا جی کو
ترے آنے سے کیا یتیمی کو[1]

بند سوم

جھوٹ ہے عید کا ہلال ہے تُو — ساغرِ بادۂ ملال ہے تُو
کہہ سُنا قصّۂ ستم زدگان — کہ ہمارا لبِ مقال ہے تُو
اے گدائے شعاعِ پرتوِ مہر — ہمہ تن کاسۂ سوال ہے تُو
چشمۂ مہر پر نظر ہے تری — تشنہ کامِ مئے کمال ہے تُو
یہ دکھاوا ہے سب تلاشِ کمال — یا بہ منزل گہِ زوال ہے تُو
ہائے شاید خبر نہیں تجھ کو — اپنی اُمّید کا مآل ہے تُو
بڑھ گیا خم مرے مقدّر کا — کیوں نہ کہہ دیں کہ ہمثال ہے تُو
میرے شوقِ لباسِ نَو کے لیے — سبق آموزِ انفعال ہے تُو[2]

---

[1] یتیم کہتا ہے کہ سب لوگ کل خوشیاں منائیں گے اور میرے پاس لباس نہیں لہٰذا اے ہلال عید تیرے طلوع سے یتیموں کو کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ [2] یتیم کا دل چونکہ دردمند ہے اس لیے وہ ہلال کو طعنے دیتا ہے۔ کہتا ہے تو رنج کی شراب کا پیالہ ہے تیری صورت لب کی سی ہے ستم نصیبوں کا قصہ سنا دے۔ تو کاسۂ گدائی لے کر سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے اور تو یتیموں کی امید کا خاتمہ ہے۔

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں

بند چہارم

ستم گوشِ باغباں ہوں میں — خبرِ آمدِ خزاں ہوں میں[1]
شرمسارِ متاعِ ہستی ہوں — مایۂ نازشِ زیاں ہوں میں
مجھ سے شرما گیا تبسم بھی — کہ سراپا لبِ فغاں ہوں میں
بار ہوں طاقتِ شنیدن پر — کس مصیبت کی داستاں ہوں میں
آہ منزل نہیں نصیبوں میں — موجۂ گردِ کارواں ہوں میں
اپنی بے مایگی پہ نازاں ہوں — مفت جاتا ہوں کیا گراں ہوں میں
اے فلک! خوانِ زندگی پہ مگر — کوئی ناخواندہ میہماں ہوں میں
ستمِ ناروا سے مرتا ہوں — آسماں کا مزاج داں ہوں میں
آرزو یاس کو یہ کہتی ہے — اِک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

ایسی قسمت کسی کی ہوتی ہے
آہ میری اثر کو روتی ہے

بند پنجم

بن کے نشتر چُبھا ہے تو دل میں — آرزُو ہو گئی لہُو دِل میں

---

[1] اس بند سے یتیم کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

چاکِ دل پرنثار ہوتی ہے — حسرتِ سوزنِ رفو دل میں
یاس نقشہ جمائے جاتی ہے — چھُپتی پھرتی ہے آرزو دل میں
درد تیزی سے بڑھ گیا اے غم! — کیا رہی تیری آبرو دل میں
دو گھڑی بیٹھنے نہیں دیتی — ہے کوئی چیز فتنہ خو دل میں
گرہِ رشتۂ حیات نہ ہو — یہ جو ہوتی ہے آرزو دل میں
دیکھ اے یاس اب تلک باقی — خُونِ امّید کی ہے بُو دل میں
عمر تیری بڑی ہے یادِ پدر! — تھی ابھی تیری گفتگو دل میں
اے خیالِ مسرتِ طفلی! — آگیا ہے کدھر سے تُو دل میں

دردِ دل کا بھی کیا فسانہ ہے
خون رونے کا اک بہانہ ہے

بند ششم

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے — رنگ اپنا جمائے جاتی ہے
اے سبوئے مئے شفق اے شام — تو مئے بے خودی پلاتی ہے
سرمۂ دیدۂ اُفق بن کر — چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے
کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور — تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے
ریزشِ دانہ ہائے اختر کو — مزرعِ آسماں میں آتی ہے[1]

---

[1] یعنی شام اس لیے آتی ہے کہ آسمان کی کھیتی میں تاروں کے دانے بودے۔

تو پرِ طیرِ آشیاں رَو کو　　چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے
صبح در آستیں ہے تو شاید　　آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے
تو پیامِ وفاتِ بیداری　　محفلِ زندگی میں لاتی ہے
اپنے دامن میں بھر کے غنچہ و گل　　خواب لے کر چمن میں آتی ہے

تیری تاثیر ہو گئی آخر
میری تقدیر سو گئی آخر

بند ہفتم

آبرو جائے موت کی نہ کہیں　　موت بن جائے بیکسی نہ کہیں
درد کو زندگی سمجھتے ہیں　　جا وداں ہو یہ زندگی نہ کہیں
ہوں وہ بیکس کہ ڈرتا رہتا ہوں　　چھوڑ دے مجھ کو بیکسی نہ کہیں
زخم منت پذیرِ مرہم ہے　　چھپ کے سنتی ہو چاندنی نہ کہیں
غنچۂ دل میں ہے چٹک ایسی　　اِس کلی میں ہو بیکلی نہ کہیں
ہوں نفس در نفس مثالِ سحر　　موت ہو میری زندگی نہ کہیں
گاہے ماہے ہلال آتا ہے　　ہو لبِ نانِ مفلسی نہ کہیں[1]
ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو　　اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں

---

[1] ہلال کبھی کبھی نکلتا ہے تسیم کہتا ہے کہ یہ غالبًا غریبوں کی روٹی کا کنارہ ہے یعنی جس طرح غریبوں کو مدت کے بعد روٹی کا کوئی ٹکڑا ملتا ہے اسی طرح ہلال بھی مہینہ گزار کر طلوع ہوتا ہے۔

خطِ دستِ سوال ہی اپنا　　ہو رگِ جانِ مفلسی نہ کہیں

قابلِ بحرِ زندگی نہ ہوا

ٹکڑے ٹکڑے مرا سفینہ ہوا

بندِ ہشتم

سیر میں اب نہ دل لگائیں گے　　کس کی انگلی پکڑ کے جائیں گے

صبح جانا کسی کا وہ گھر سے　　اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے

کھیل میں آ گئی جو چوٹ کبھی　　کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے

کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے　　ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے

سننے والے گزر گئے اے دل　　اپنے شکوے کسے سنائیں گے

اُٹھ گئے آہ قدرداں اپنے　　لِکھ کے تختی کسے دکھائیں گے

دردِ دل کی زباں نرالی ہے　　تجھ کو اے خامشی! سکھائیں گے

کس غضب کے نصیب ہیں اپنے　　روتے آئے تھے، روتے جائیں گے

عید آئی ہے اے لباسِ کہن　　اب ترے چاک پھر سلائیں گے

عید کا چاند آشکار ہوا

تیرِ غم کا جگر کے پار ہوا[1]

---

[1] توجہ کے قابل امر یہ ہے کہ اس بند میں وہی باتیں بیان کی ہیں جو بچوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ مثلاً والد کے ساتھ سیر کو جانا، صبح کے وقت والد کے ساتھ جانے پر اصرار کرنا، مدرسے میں کسی روز نہ جا سکے تو دوسرے دن والد کو ساتھ لے جانا، تختی لکھ کر دکھانا وغیرہ۔ یتیم لازماً انھیں باتوں کو یاد کر کے والدین کو روئے گا۔

بندِ نہم

آنکھ میں تارِ اشک پیہم ہے کیا رواں آبِ خنجرِ غم ہے
دیکھ اے ضبط گر نہ جائے کہیں اشکِ غم آبروے ماتم ہے
اے مہِ عید! تو ہلال نہیں سینہ کاوی کو ناخنِ غم ہے
پھول ایسا ہے اشکِ چشمِ یتیم رونقِ خانۂ محرّم ہے
اُس گلستاں میں آشیاں ہے مرا ہر شجر جس کا نخلِ ماتم ہے
کس کے نظارۂ مصیبت کو ماہ بامِ فلک پہ یُوں خم ہے
خونِ امّید ہے یہ اشک نہیں کس بھلاوے میں چشمِ پُرنم ہے
پُوچھنا اے نفس نکل کے ذرا کیوں اجل کا مزاج برہم ہے
اے فلک کیوں زمیں ہے بر سرِ کیں؟ میری بربادیوں کو تُو کم ہے؟

ہے جو دل میں نہاں کہیں کیونکر
مفلسی کے ستم سہیں کیونکر

بندِ دہم

ہاتھ اے مفلسی! صفا ہے ترا ہاے کیا تیر بے خطا ہے ترا
تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار بد نصیبی کو آسرا ہے ترا
مایۂ صد شکستِ قیمتِ دل دہر میں ایک سامنا ہے ترا
تُو بھلا مجھ پہ کیوں نثار نہ ہو؟ کہ یتیمی تو مدعا ہے ترا

مسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم　　یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا
اِلتجا پر خموشیِ منعم　　ایک فقرہ جلا بُھنا ہے ترا[1]
یہ بھی کیا دامنِ یتیمی ہے　　نام کیسا نکل گیا ہے ترا
موت مانگے سے بھی نہیں آتی　　درد کیا زندگی فزا ہے ترا
شورِ آوازِ چاکِ پیراہن　　لبِ اظہارِ مدعا ہے ترا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اِس چمن کو نہیں بہار پسند

بند یازدہم

چمنِ خار خار ہے دنیا　　خونِ صد نوبہار ہے دنیا
زندگی نام رکھ دیا کِس نے　　موت کا انتظار ہے دنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور　　دیکھنے کو بہار ہے دنیا
ڈھونڈ لیتی ہے اِک نہ اِک پہلو　　درد کی غمگسار ہے دنیا
ہے تمنا فزا ہوائے جہاں　　کیا شکستِ خمار ہے دنیا
خون روتا ہے شوقِ منزل کا　　رہزنِ رہ گزار ہے دنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی　　دولتِ زیرِ مار ہے دنیا[2]

۱؎ مفلس یتیم کسی دولت والے سے سوال کرتا ہے تو اس کا چپ رہنا بھی یتیم کو جلا بُھنا فقرہ معلوم ہوتا ہے۔
۲؎ دنیا بے شک دولت ہے لیکن اس پر سانپ بیٹھا ہے۔ جو شخص دنیوی دولت طلب کرتا ہے سانپ اسے ڈس لیتا ہے اور اس کی جان نکل جاتی ہے۔

یاس و امید کا ملاوا ہے　　کوئی جاتی بہار ہے دنیا[۱]
خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں　　چرخ کی رازدار ہے دنیا

اہلِ دنیا و شرحِ دردِ جگر
رگِ بے خون و کاوشِ نشتر

بند دوازدہم

کیا قیامت ہیں غم کے آنسو بھی　　بڑھتا جاتا ہے دردِ پہلو بھی
نوکِ مژگاں سے نشترِ رگِ اشک　　خوں فشاں ہو رہے ہیں آنسو بھی
ٹوٹی پھوٹی زباں میں کہتا ہے　　رنگِ احوال، دردِ پہلو بھی
سوزشِ اشکِ غم ہے برقِ مژہ　　جل گیا سبزۂ لبِ جُو بھی
آہ اے چشمِ اشک ریزِ یتیم　　خواب کا اک خیال ہے تُو بھی
حسرتِ دیدِ غمگسار نہ پوچھ　　چشم ریزاں ہیں میرے آنسو بھی
قطرۂ خوں تو عام ہے لیکن　　دل کو کہتے ہیں دردِ پہلو بھی
آ ترے صدقے اے خیالِ پدر　　عید کا چاند ہو گیا تُو بھی[۲]
ہائے اے برق! بن گئی گر کر　　میرے حاصل کی آبرو تُو بھی

عید کا چاند اضطراب بنا
طاقِ آتش گہِ عذاب بنا

---

۱ "جاتی بہار" کا خاصا یہ ہے کہ اس میں کچھ بہار کا رنگ بھی ہو اور خزاں کے آثار بھی نمودار ہو جائیں۔ گویا امید و یاس دونوں جمع ہوں۔ ۲ سبحان اللہ! کتنا دردبھرا شعر ہے اور کس درجہ بے تکلف!

بندِ سیزدہم

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے — آسماں بن گیا ستا کے مجھے
ہائے بے خود کیا تصوّر نے — داستانِ عرب سُنا کے مجھے
ہے تصدّق مری یتیمی پر — کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے
چاہیے اے خیال، پاسِ ادب — تُو کہاں لے گیا اُڑا کے مجھے
ہائے اے آتشِ فراقِ پدر — خاک کر دے جلا جلا کے مجھے
اے یتیمی فتادگی بن کر — چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے
لبِ اظہار وا ہُوا نہ کبھی — تم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے
پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا — کارواں لے چلے اٹھا کے مجھے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں؟ — کہ مرے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں

بندِ چہاردہم

کیا ہنسی ضبط کی اڑاتے ہیں — اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں
اِک بہانہ ہلالِ عید کا ہے — قوم کو حالِ دل سُناتے ہیں
کس مزے کی ہے داستاں اپنی — قوم ہنستی ہے ہم ہنساتے ہیں
دیکھ اے زندگی مرے آنسو — یہ ترے نقش کو مٹاتے ہیں

ہاں بتا اے فلک کہ طفلی میں   درد کو کس طرح چھپاتے ہیں
خاک راہِ فنا میں اُڑتی ہے   منہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا کوئی   جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں
اِس طرح کی ہے داستاں اپنی   ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں
ھم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے   یہ قیامت کے دُکھ اٹھاتے ہیں

آبرو بڑھ گئی خموشی کی
یہ زباں بن گئی یتیمی کی

بند پانزدہم

رنگِ گلشن جو ہو خزاں کے لیے   قہر ہوتا ہے باغباں کے لیے
چاہیے پاس برق کا اے دل   ہو خسِ خشک آشیاں کے لیے
اُڑ کے آتا ہے رنگِ عارضِ زرد   کس مصیبت کی داستاں کے لیے
حال دل کا سُنا دیا سارا   کچھ بھی رکھّا نہ رازداں کے لیے
ہے اقامت طلب جدار مری   قوم ہو خضر اس مکاں کے لیے[1]

---

[1] اس میں قرآن مجید کے اس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ کہف میں بیان ہُوا ہے حضرت موسیٰ علیہ السّلام حضرت خضر علیہ السّلام کے ساتھ جا رہے تھے تو حضرت خضرؑ نے کوئی اُجرت لیے بغیر ایک یتیم کی گرتی ہوئی دیوار کی مرمّت کر دی اس لیے کہ اس دیوار کے نیچے یتیم کے والدین کا خزانہ محفوظ تھا۔ دیوار گر جاتی تو لوگوں کو خزانے کا پتہ مل جاتا اور وہ اسے نکال لیتے۔ "جدار" دیوار کو کہتے ہیں یتیم کہتا ہے کہ میری دیوار بھی مرمّت طلب ہے۔ قوم اگر حضرت خضرؑ کی طرح ہمت کرے تو مرمّت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے "خضرِ راہ" میں بھی اقبالؔ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:۔   کشتیِ مسکین و جانِ پاک و "دیوارِ یتیم"

ہاتھ اے قومِ مہرباں تیرا ابر ہے کس کے گلستاں کے لیے
حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں اَور رکھیں اسے کہاں کے لیے
صورتِ شمعِ خانۂ مفلس خامشی ہے مری زباں کے لیے[1]
اب مگر ضبط کا نہیں یارا لب ترسنے لگے فغاں کے لیے
دردمندوں کی دردخواہ ہے قوم
بے کسوں کی امیدگاہ ہے قوم

اِسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مُسلمانوں سے

یہ تیسری نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء) میں پڑھی۔ یہ نظم ۲۳ فروری کے دوسرے جلسے میں پڑھی گئی تھی جس کے صدر میاں نظام الدین صاحب سب جج راولپنڈی تھے یہ بھی چھپوائی گئی تھی۔ اس کی خریداری میں لوگوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک کاپی دس دس روپے کو فروخت ہوئی اور اس ذریعے سے ایک معقول رقم انجمن کو ملی۔ (رویداد انجمن حمایت اسلام، بابت ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۲)

اِس سلسلے میں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اقبال کی مشہور نظموں میں سے "نالۂ یتیم"، "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" اور "فریادِ اُمت" کثیر تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہیں لیکن یہ نظم یا تو اس وقت بکی تھی جب یہ پڑھی گئی تھی یا حمایت اسلام کی رویداد میں چھپ کر رہ گئی۔ اِس لحاظ سے آج یہ بالکل نایاب ہے بلکہ اکثر اصحاب کو اس کے وجود کا بھی علم نہیں۔

بندِ اوّل

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج آئینے کو ہے سکندر سے سرِ تقریر آج[2]

---

[1] جس طرح غریب کے گھر کی شمع اکثر خاموش رہتی ہے یعنی روشن نہیں ہوتی، یتیم کہتا ہے کہ وہی حالت میری زبان کی ہے
[2] معمار اور سکندر سے مراد مسلمانانِ پنجاب ہیں، تعمیر اور آئینے سے مراد "اسلامیہ کالج"۔

نقش نے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا — شوخیِ تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج
سن کے کیا کہتی ہے دیکھیں بادِ عنبر بارِ صبح — لب کشا ہونے کو ہے اِک غنچۂ دلگیر آج
دیکھیے گل کس طرح کہتا ہے احوالِ خزاں — مانگ کر لایا ہے بلبل سے لبِ تقریر آج
عشق ہر صورت سے ہے آمادۂ تزئینِ حسن — ہے پرِ پروانہ سے کارِ لبِ گلگیر آج
گرمیِ فریاد کی آتش گدازی دیکھنا — شمع کے اشکوں میں ہے لپٹی ہوئی تنویر آج
آہ میں یارب وہ کیا اندازِ معشوقانہ تھا — جوشِ لذت میں فدا ہو ہو گئی تاثیر آج
عقدے کھل جانے کو ہیں مثلِ دہانِ روزہ دار — ہے ہلالِ عید اپنا ناخنِ تدبیر آج
دیکھیے اِس سحر کا ہوتا ہے کس کس پر اثر — ہے دخانِ شمعِ محفل سرمۂ تسخیر آج
زینتِ محفل ہیں فرہادانِ شیریں عطا — اِس محل میں ہر رواں ہونے کو جوئے شیر آج[1]

صبر را از منزلِ دل پا بجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام

بندِ دوم

آج ہم حالِ دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں — اِس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں
ہر نفس پیچیدہ ہے مانندِ دودِ شمعِ طور — داستانِ دلکشِ مہر و وفا کہنے کو ہیں
دیکھیے محفل میں تڑپاتا ہے کس کس کو یہ شور — مرثیہ اپنے دلِ گم گشتہ کا کہنے کو ہیں
بوئے گل لپٹی ہوئی ہو غنچۂ منقار میں — ورنہ مرغانِ چمن رنگیں نوا کہنے کو ہیں

---

[1] فرہادانِ شیریں عطا: سخاوت اور داد و دہش کی شیریں کے عاشق، مسلمان۔ جوئے شیر سے مراد روپے پیسے کی نہر۔

تجھ کو اے شوقِ جراحت دیں تسلی کس طرح؟ — آہ یہ تیرِ نظر بھی بے خطا کہنے کو ہیں

قصۂ مطلب طویل و دفترِ تقریر تنگ — خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہیں

محفلِ عشرت میں ہے کیا جانے کس کا انتظار؟ — آج ہر آہٹ کو ہم آوازِ پا کہنے کو ہیں

ہے سُوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں — ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں

ہے گہرباری پہ مائل تو جو اے دستِ کرم! — ہم تجھے ابرِ سخا، بحرِ عطا کہنے کو ہیں

خود بخود منہ سے نکل جانا بھی اچھا ہے مگر — دم تو لے آخر تجھے اے مُدّعا! کہنے کو ہیں

باز اعجازِ مسیحا را ہویدا کردہ ام
پیکرے را با زبانِ خامہ گویا کردہ ام

بندِ سوم

ابر بن کر تم جو اس گلشن پہ گوہر بار ہو — بخت سبزے کا مثالِ دیدۂ بیدار ہو

میں صدف، تم ابرِ نیساں، میں گلستاں، تم بہار — مزرعِ نوخیز میں تم ابرِ دریا بار ہو

میں نتیجہ اِک حدیثِ اُمّیِ یثرب کا ہوں — تم اُسی اُمّی کی اُمّت کے عَلَم بردار ہو[1]

اِک مہِ نَو آسمانِ علم و حکمت پر ہوں میں — تم بھی اِک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو

نام لیوا اک دیارِ علم و حکمت کا ہوں میں — اَور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو

یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں — مَیں مسلمانوں کا گلشن، تم مری دیوار ہو

تم اگر چاہو تو اس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں — ہر کلی گُل ہو کے اس کی زینتِ دستار ہو

---

[1] یہ کالج کہہ رہا ہے، اسے "حدیثِ اُمّیِ یثرب" کا نتیجہ اس لیے کہا کہ حضور صلعم نے تعلیم کی تاکید فرمائی ہے۔

رہنے والے انتخابِ ہفت کشور کے ہو تم — کیوں نہ اس گلشن کی نکہت روکشِ تاتار ہو
میری دیواروں کو چھو جائے جو اکسیرِ عطا — خاک بھی میری مثالِ گوہرِ شہوار ہو
دیکھ اے ذوقِ خریداری! یہ موقع ہے کہیں — حُسنِ یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسفِ علم استم و پنجاب کنعانِ من است
از دمیدِ صبحِ حکمت چاکِ دامانِ من است

بندِ چہارم

مجھ میں وہ جادو ہے روتوں کو ہنسا سکتا ہوں میں — قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہوں میں
عید ہوں میں اپنے نگاہِ چشمِ نظّارا تری — شاہدِ مقصود کا پردہ اُٹھا سکتا ہوں میں
طیرِ حکمت باغِ دُنیا میں ہوں اے صیّاد! ہیں — دام تو سونے کا بنوا لے تو آ سکتا ہوں میں[1]
طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر — آہ وہ دلکش مرقّع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آئیں اُڑ اُڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے — شمع اِک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو — ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دِکھا سکتا ہوں میں
گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے — وہ صدا پھر اس زمانے کو سُنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو — پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں
گھر کسی کا جن کی ضو سے غیرتِ مشرق بنے — اس انوکھی شان کے موتی لٹا سکتا ہوں میں
کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ ہمت مجھے — منزلِ مقصود کا رستہ دکھا سکتا ہوں میں

---

[1] میں حکمت کا پرندہ ہوں اور مجھے شکار کرنے والا سونے کا دام بنالے تو پھانس سکے گا یعنی روپیہ صرف کرنے ہی سے علم و حکمت سیکھے جا سکتے ہیں۔

از خمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را
ہاں، مبارک سرزمینِ خطۂ پنجاب را

بند پنجم

بن گیا ہے دستِ سائل دامنِ گلزار کیا
باغ پر چھایا ہوا ہے ابرِ گوہر بار کیا؟
کچھ ہوا ایسی چلے یا رب کہ گلشن خیز ہوں
خار کیا، گُل کی کلی کیا غنچہ، منقار کیا؟
حسن خود منت کشِ چشمِ تماشائی ہوا
اب نہیں دنیا میں باقی طالبِ دیدار کیا؟
اک جہاں آیا ہے گلگشتِ چمن کے واسطے
باغباں باہر نہ پھینکے گا چمن کے خار کیا؟
زندگی اپنی زمانے میں تمہارے دم سے ہے
ہے خطِ دستِ کرم میرے نفس کا تار کیا؟
ہاں جسے چھونا ہو دامانِ ثریا کو کبھی
ایک دو اینٹوں سے اُٹھ سکتی ہے وہ دیوار کیا؟
تیغ کے بھی دن کبھی تھے، اب قلم کا دور ہے
بن گئی کشور کُشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا
خوبیِ قسمت سے پہنچا علم کا یوسف یہاں
ورنہ کیا پنجاب اور پنجاب کا بازار کیا؟
مجھ سے وابستہ نہیں کیا آبروئے پنجاب کی
تیر کی صورت نہیں ہیں طعنۂ اغیار کیا؟
آرزوے دل کو بھی کہنا کوئی دشوار ہے
کام خاموشی سے تجھ کو اے لبِ اظہار کیا؟

گوش را جویاے آوازِ غریباں کردہ
شانہ را مائل بہ گیسوے پریشاں کردہ

بند ششم

کیوں نہ دیوانے ہوں لبِ سوزِ نہاں کے واسطے
ڈھونڈ کر محفل نکالی داستاں کے واسطے

اس بھری محفل میں اپنا رازِ دل کہتا ہوں میں
باغ ہی زیبا ہے بلبل کی فغاں کے واسطے

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اخترِ جبینِ کہکشاں کے واسطے

باغباں کا ڈر کہیں، خطرہ کہیں صیاد کا
مشکلیں ہوتی ہیں سوا اک آشیاں کے واسطے

خضرِ ہمت کا رفیقِ راہِ منزل ہو اگر
گلستاں تیرے لیے تُو گلستاں کے واسطے

زندگی وہ چاہیے دنیا کی زینت جس سے ہو
شمعِ روشن بن کے رہ بزمِ جہاں کے واسطے

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اُٹھ کر کنواں؟
رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے؟

گلشنِ عالم میں وہ دلکش نظارہ ڈھونڈنا
آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے

یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامیِ محنت میں کچھ
جا رہا ہے تُو کہاں آرامِ جاں کے واسطے

روشن از نورِ مہِ حکمت شبستانِ من است
کاں دُرِ گم گشتۂ مومن بداماں من است

بندِ ہفتم

ہاں رگِ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشقِ اخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی

جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایماں ہے بس
نقشۂ خیر القروں آنکھوں کو دکھلائے کوئی

ہے پریشاں بادِ ناکامی سے گیسوئے مُراد
شانۂ دستِ عطا سے اس کو سلجھائے کوئی

بہرِ استقبال استادہ ہے ہر گُل کی کلی
اس چمن میں صورتِ بادِ صبا آئے کوئی

یہ گُل و گلزار صدقہ اُمیِ یثرب کا ہے
دیکھنا اے باغباں غنچہ نہ مرجھائے کوئی

مدّعا کو یہ سکھایا شورشِ فریاد نے / خود بخود میری طرح منہ سے نکل آئے کوئی
کہ گئی ذوقِ کرم کو شوخیِ حسنِ طلب / ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی
اِک چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں / ابر کی صورت اُٹھے اُٹھ کر برس جائے کوئی
تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیِ دستِ طلب / دیکھیے اِس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی
فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دُنیا بھی ضرور / ہیں بہت دشمن کہیں دھوکا نہ دے جائے کوئی

خویش را مسلم ہمے گوئید و با ما کار نیست
رشتۂ تسبیحِ شاں جز رشتۂ زنّار نیست

بندِ ہشتم

علم کا محبوب رونق بخشِ کاشانہ تو ہو / انجمن اپنی مثالِ بزمِ جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا / پھر ذرا بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
بزم میں شوقِ مئے حکمت ہوا پیدا اگر / مے بھی بٹ جائے گی پہلے فکرِ پیمانہ تو ہو[۱]
یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت / پر ذرا ویسا منوّر اپنا کاشانہ تو ہو
یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمھیں / شان شاہانہ نہ ہو میری امیرانہ تو ہو
پائمالی ہے جہاں میں ترکِ حکمت کی سزا / اِس چمن سے مثلِ سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو
وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا / ہاں مگر پہلے روش تیری گدایانہ تو ہو
آنکھ کو بیدار کر دیتی ہے یہ دیوانگی / کوئی اِس حسنِ جہاں آرا کا دیوانہ تو ہو

۱؎ پیمانے سے مُراد کالج ہے یعنی کالج بنے گا تو حکمت کی شراب بزمِ شوق میں بٹ سکے گی۔

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے — زندگی تیری جہاں میں دل رُبا یانہ تو ہو
جل کے مرجانا چراغِ علم پر مشکل نہیں — پہلے تیرے دل میں پیدا نور پروانہ تو ہو

اے کہ حرفِ اُطلبوا لوکان بالصّین گفتۂ[1]
گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ اُمّت سُفتۂ

بندِ نہم

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردۂ — سینہ ہا را از تجلّی یوسفستاں کردۂ
اے کہ صد طُور است پیدا از نشانِ پائے تو — خاکِ یثرب را تجلّی گاہِ عرفاں کردۂ
اے کہ ذاتِ تو نہاں در پردۂ عینِ عرب — روئے خود را در نقابِ میم پنہاں کردۂ
اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہ ہر مفہوم شرک[2] — بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردۂ
اے کہ ہم نام خدا، بابِ دیارِ علم تو[3] — اُمّیے بودی و حکمت را نمایاں کردۂ
آتشِ اُلفت بہ دامانِ ربوبیّت زدی — عالمے را صورتِ آئینہ حیراں کردۂ
فیضِ تو دشتِ عرب را مطلعِ انظار ساخت — خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردۂ
دِل نہ نالد در فراقِ ماسوائے نورِ تو — خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردۂ

---

[1] اشارہ ہے اطلبوا العلم ولو کان بالصّین علم ڈھونڈو اگرچہ وہ چین میں ہو۔

[2] یہ ۱۹۰۲ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت میرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوّت کا دعوےٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے، خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلّی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔

[3] حضرت علیؓ کی طرف اشارہ ہے اور "علی" اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ نیز انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابہا کا ترجمہ ہے

گل فرستادن بہ بحرِ بے کراں می زیبد بش | قطرۂ بے مایہ راہم دستِ طوفاں کردۂ
بے عمل را لطف تو لا تقنطوا آموز گشت | بسکہ وابر ہر کسے بابِ دبستاں کردۂ

ہاں دعا کن بہرِ ما، اے مایۂ ایمانِ ما
پُر شود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

دین و دنیا

اقبال کی نظم چونکہ جلسے کی رونق اور انجمن کے چندے کے لیے بہت موثر ہوتی تھی، اِس لیے انجمن کی خواہش رہتی تھی کہ وہ ایک کے بجائے کئی نظمیں پڑھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں "اسلامیہ کالج کے خطاب" والی مستقل نظم سے ایک روز پیشتر ۲۲ فروری کو خان بہادر شیخ حاجی خدا بخش ڈسٹرکٹ جج گورداسپور کی صدارت میں یہ لمبا قطعہ بھی پڑھا تھا۔

اِس نظم میں چونکہ بعض ظریفانہ اِشارے تھے جنھیں بے وجہ بعض لوگوں نے اپنی طرف منسوب کر لیا، اس لیے ان میں ناراضگی سی پیدا ہوئی۔ اقبال نے دوسرے دن یہ غلط فہمی رفع کر دی جس سے سب صاحب خوش ہو گئے

(رویداد انجمن حمایت اسلام بابت سنہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۷، ۲۸)

دہلی و دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں | شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وہاں | ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے
وعظ کہتے تھے کوئی مسلم نہ انگریزی پڑھے | کفر ہے آغاز اِس بولی کا، کفر انجام ہے
میں نے یہ سن کر کیا ان کو مخاطب اس طرح | آپ کا ہونا بھی اپنی گردشِ ایام ہے

کیوں مسلمانوں کی کشتی کو اُلٹ دیتے نہیں
آپ کے دِل میں جو اتنی کاوشِ انجام ہے

کفر کی تعریف میں کہتے ہیں انگریزی ہے شرط
آپ کی منطق بھی حضرت قابلِ انعام ہے

پھر اسی پر اکتفا کرتے نہیں، کہتے ہیں یہ
مذہبِ منصور ہے مقبولِ خاص و عام ہے

واہ کیا کہنا ہے کیا تاثیر ہے کیا وعظ ہے
آپ کی ہر بات گویا بمبئی کا آم ہے

ادعائے حُبِ دیں ہے آپ کو اِس وعظ پر
ایسی حُب کو لام کی تشدید سے سلام ہے

مسلموں کو فکرِ دیں ہو فکرِ دنیا کچھ نہ ہو
کچے حنظل کی طرح یہ بھی خیالِ خام ہے

بندہ پرور اب تو ہم چالوں میں آنے کے نہیں
آپ کی دیں داریوں کا راز طشت از بام ہے

خوب قرآں کو بنایا دامِ تزویر آپ نے
کامیابی کیوں نہ ہو حضرت خایہ صادام ہے

صدقے جاؤں فہم پر دنیا نہیں دیں سے الگ
یہ تو اک پابندیِ احکامِ دیں کا نام ہے

بندہ پرور بندگی اپنی یہیں سے ہو قبول
وعظ اب ایسا صدائے مُرغِ بے ہنگام ہے

ان سے پوچھو ہند ہی کیا رہ گیا تھا آپ کو
اور بھی تو دیس ہیں آخر جہاں آرام ہے

باندھیے بستر کہ اِن وعظوں کی خاطر سامنے
انڈمن ہے چین ہے جاپان ہے آسام ہے

جب کہا حضرت! کہ ہیں اب ڈھنگ ہمدردی کے اور
دین کی تائید انگریزی پڑھوں کا کام ہے

جوش میں کیا آئے اک سوڈے کی بوتل کھل گئی
گالیوں کے بس سے منہ اُن کا چھلکتا جام ہے

ایسے دیں داروں سے تنگ آئے ہیں آخر کیا کریں
آج سُنتے ہیں کہ جمسٹ جی کے ہاں لیلام ہے[1]

آپ کی تعریف لکھنی ہے قلم کو اِس طرح
جس طرح گھوڑے کے حق میں سنکھیا بادام ہے

---

۱ جمسٹ جی پارسی کا نیلام گھر اُس زمانے میں بہت مشہور تھا۔

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے جہاں　اُن سے اُمیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے ؎۱

بیچتے ہیں برف کی قلفی دسمبر میں چہ خوش　ایسے دیں داروں کا سر بے عین و قاف و لام ہے

نظم چھپوانے جو صدیقی پریس میں میں گیا　مطبع مطبوع ہے مشہور خاص و عام ہے

ہیں یہاں اک دوست کالج کے زمانے سے مرے　آپ کے دم سے پریس کی عزّت و اکرام ہے

نام محی الدین ہے کرتے ہیں وہ احیائے دین　آپ کا دینی کتابوں کی اشاعت کام ہے

میں نے یہ پوچھا کہ حضرت آپ کو فرصت تو ہے　نظم چھپوانی ہے مجھ کو اک ذرا سا کام ہے

دُکھ نہ جائے دیکھنا شاعر کا دِل انکار سے　یہ وہ تلخی ہے کہ مثلِ تلخیِ دُشنام ہے

آج کل لوگوں کو ہے انکار کی عادت بہت　نام بیچارے حسینوں کا یونہی بدنام ہے

ہنس کے فرمانے لگے یہ انجمن کا کام ہے　انجمن کا کام کیا ہے خدمتِ اسلام ہے

ہم کریں اس کام کو سو کام اپنے چھوڑ کر　آپ کیا سمجھے ہیں حضرت! یہ بھی کوئی کام ہے

چھاپ دینا نظم کا مجھ پر گراں کوئی نہیں　خدمتِ دیں اپنے دل کو جامۂ احرام ہے

ہو اگر فرصت نہ مجھ کو اور سے چھپوا کے دوں　ہو نہ اتنا بھی تو جھوٹا دعویِٰ اسلام ہے

نظم ہے کم آخر کوئی طاعون کا ٹیکا نہیں　چھاپنا چاہیے جو کوئی دس منٹ کا کام ہے

بات یہ چھوٹی سی ہے لیکن مروّت کو تو دیکھ　حق تو یہ ہے جوشِ ہمدردی اسی کا نام ہے

بے مروّت ہو عزیزوں کی نگاہوں میں اگر　پھر وہی ہم ہیں وہی شوکت وہی اسلام ہے

؎۱ سمجھا گیا تھا کہ اِس شعر میں اشارہ زبدۃ الحکماء حکیم غلام نبی کی طرف ہے جو موچی دروازہ کے مشہور طبیب تھے۔ یہ غلط فہمی تھی۔

اِس کہانی کے بیاں سے تھی غرض اِک اَور ہی
میرے ہر مصرع میں مخفی صنعتِ ایہام ہے

اِس طرح دُنیا کا بندہ بھی نہ ہونا چاہیے
ایسی دُنیا ہو تو نُورالدین گنگا رام ہے

چاہیے ہر کام میں ہو دِین کی خدمت کا پاس
حضرتِ مدفونِ یثرب کا یہی پیغام ہے

روح ہی جب تک بدن میں عشق ہم جنسوں سے ہو
عشق بھی اِک مذہبِ اسلام ہی کا نام ہے

ہے دماغوں کی لطافت کچھ اسی کا سوز و ساز
عشق اس دُنیا کی انگیٹھی میں عُودِ خام ہے

سر جھکائے ایک دن جاتا تھا ٹکسالی کو میں
دائیں بائیں گھُورنے سے آنکھ کو کیا کام ہے

آ رہا تھا میرے پیچھے کوئی یہ کہتا ہُوا
آہ یہ دُنیا سراپا مایۂ آلام ہے

بابو جی درویش ہوں میں، ہو چکا آٹا مرا
فکر ہے فردا کی اَور دل ہے کہ بے آرام ہے

علمِ دیں کا شوق ہے دُنیا سے کچھ مطلب نہیں
دال دِل کو اپنے دالِ دین سے اِدغام ہے

گاؤں سے یاں کھینچ لایا ہے مجھے پڑھنے کا شوق
علمِ دیں کے ساتھ اپنے دل کو نسبت تام ہے

یہ کہا اَور جھٹ دکھا دی اک پُرانی سی کتاب
میں نے یہ سمجھا کوئی ڈگری ہے یا اشٹام ہے

میں نے یہ سُن کر کہا دُکھتے ہوئے دل سے اسے
واہ کیا نیت ہے کیا اوقات کیا اسلام ہے

خوار ہے تُو جیسے اسٹیشن پہ ہو بلٹی کا مال
تیری دِین داری کا یہ ذِلّت ہی کیا انجام ہے؟

نیچری مجھ کو سمجھ کر ہو گئے کافور آپ
آج کل سچی نصیحت کا یہی انعام ہے

الغرض دیں ہو تو اس کے ساتھ کچھ دنیا بھی ہو
ورنہ روزِ روشنِ اسلام کی پھر شام ہے

دین، دنیا کا محافظ ہے اگر سمجھے کوئی
جیسے بچے کے گلے میں ناخنِ ضرغام ہے

یُوں تو اس دنیائے دوں میں سیکڑوں امراض ہیں
پر بخیلوں کے لیے چندہ بھی اِک سرسام ہے

چندہ جب لینے گئے کہلا دیا بیمار ہیں ٹل گئے جب دم کہا پہلے سے کچھ آرام ہے

ذکر جب اقبال کا آیا تو بول اُٹھا کوئی

رہتا ہے بھاٹی میں اِک دیوانۂ اصنام ہے

ابرِ گُہر بار

یہ چوتھی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے اٹھارھویں سالانہ اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو ظہر و عصر کے درمیان پڑھی۔ اس کا عنوان تھا: "ابرِ گہر بار" یعنی نعتِ عاشقانۂ جناب سرورِ کائنات و فریادِ اُمت برآستانۂ آں ذات بابرکات۔ خان بہادر غلام احمد خاں مشیر مال ریاست جموں و کشمیر جلسے کے صدر تھے۔

دِل میں جو کچھ ہے زباں پر اسے لاؤں کیوں کر
ہو چھپانے کی نہ جو بات، چھپاؤں کیوں کر

شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیوں کر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اِک ناز ہے تیرا، نہ اٹھاؤں کیوں کر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت! میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیوں کر

تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیوں کر

ضبط کی تاب نہ یارا ئے خموشی مجھ کو
ہائے اِس دردِ محبت کو چھپاؤں کیوں کر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خُمِ دل سے اچھل جائے گی

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں
صورتِ شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تُو مری صورت پہ نہ جانا گلچیں!
دیکھنے کو صفتِ نُو گُلِ خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیِ فانی کو
نام آ جائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دُور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کُنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جا ہے سُنا اور کسی کو ناصح
اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں وہ مضموں کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبالؔ ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل
التجائے اَرِنی سُرخیِ افسانۂ دل[1]

یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ راہِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گیا مزرعِ ہستی تو اُگا دانۂ دل

حُسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تُو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل

کچھ اُسی کو ہے مزہ دہر میں آزادی کا
جو ہُوا قیدیِ زنجیرِ پری خانۂ دل

اُس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اَور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اِک لغزشِ مستانۂ دل

ہائے کیا جانیے، اس گھر کا مکیں کیسا ہو
ہوں جو منصور سے دربانِ درِ خانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رِہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اَور یہ مائل ہو کر
آنکھ کھُل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں بُرا ہوتا ہے
عقل آئی مجھے پابندِ سلاسل ہو کر

---

[1] پوری نظم میں سے صرف یہ بند اقبال نے "بانگِ درا" میں شامل کیا۔

آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم — اس سے پوچھے کوئی، کیا دل نے لیا دل ہو کر؟
میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ — اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عینِ ہستی ہُوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نکتے نے باطل ہو کر
خلق معقول ہے، محسوس ہے خالق اے دل! — دیکھ نادان! ذرا آپ سے غافل ہو کر
طُور پر تُو نے جو اے حضرتِ موسیٰ! دیکھا — وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر
کیا کہوں بے خودیِ شوق میں لذت کیا ہے — تُو نے دیکھا نہیں زاہد! کبھی غافل ہو کر
رہِ الفت میں رواں ہوں کبھی افتادہ ہوں — موج ہو کر کبھی خاکِ لبِ ساحل ہو کر
دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں — جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہو کر
وہ مسافر ہوں، ملے جب نہ پتا منزل کا — خود بھی مٹ جاؤں نشانِ منزل ہو کر
ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا — چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر
دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی — آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر
عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ — دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر
مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے — میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد سیّد مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ ساماں ہے اِک بے سر و ساماں ہونا — مجھ کو جمعیّتِ خاطر ہے پریشاں ہونا
تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں — "آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو بربادِ محبّت ہُوا آباد ہُوا
سازِ تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویس قرنی سے چُھپنا
کبھی برقِ نگہِ موسیٰ عمراں ہونا

قاب قوسین بھی دعویٰ بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اُٹھانا، کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مِٹ کے تری الفت میں
ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظّارۂ رخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبح تمنّا ہے براہیم استی
چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم استی

حشر میں ابر شفاعت کا گُہر بار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل! تیرا خریدار آیا

پیرہن عشق کا جب حُسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یُوں آئی
دیکھنا دیکھنا وہ کافرِ دیں دار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوشِ سودائے محبّت میں گریباں اپنا
میں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنّت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہگار آیا

وہ مری شرمِ گنہ اور وہ سفارش تیری ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری

قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا تلاطم مجھ کو کشتیِ نوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حسن کس کا مری آنکھوں میں سمایا جب سے تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو

ترے قربان میں اے ساقیِ مے خانۂ عشق میں نے اک جام کہا تو نے دیئے خم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری الفت میں کہ "فرشتوں نے لیا بہرِ تیمم مجھ کو"

گرد آسا سرِ دامن سے لگا پھرتا ہوں حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آ جائے جو یثرب کے کسی کوچے میں میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

صفتِ نوکِ سرِ خار شبِ فرقت میں چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہِ یثرب سے طور کی سمت نہ لے جائے توہم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکین کر دی شورِ محشر ہوا گلبانگِ ترنم مجھ کو

اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلم مجھ کو

ہے ابھی امتِ مرحوم کا رونا باقی دیکھ اے بے خودیِ شوق نہ کر گم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں سراپا غم بربادی ہوں
ستم دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پا کے اشارا تیرا

گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنیٔ لولاک سے پایا تیرا

ناز تھا حضرتِ موسیٰؑ کو یدِ بیضا پر
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا

چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدیؑ سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں اُمتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال اُمت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

شاہدِ قوم ہوا خنجرِ بیکار سے خوں
ہائے غفلت یہ اسے رنگِ حنا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا — یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں
ہو نہ اے قافلہ سالار! یہ اُمّت تیری — کارواں ہند میں ہے کوئی لُٹا کہتے ہیں
جن کی دیں داری میں ہو آرزوئے زرِ پنہاں — آکے دھوکے میں انھیں راہنما کہتے ہیں
لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اس نے — یہ تعصّب کو مگر گھر کا دِیا کہتے ہیں
خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں — مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں
یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا — ہائے کس ڈھنگ سے اچھّوں کو بُرا کہتے ہیں
مقصدِ لحمک لحمی پہ کھُلی ان کی زباں — یہ تو اِک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں
تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو اے شافعِ حشر — میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں
بغض للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی — دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں
جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام — ایسے بندوں کو یہ بندے "صلحا" کہتے ہیں
قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے — یہ اسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں
یہ دوا صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جانا ہو — درد کے حد سے گزرنے کو دوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیِ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

اُمرا جو ہیں وہ سُنتے نہیں اپنا کہنا — سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا
ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا — ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا
دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے — اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

همہ حسرت ہوں سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہُوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا — اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود — اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتابِ کلّ نور — چاند بھی چاند بنا پا کے اشارا تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حُسن ترا پردوں میں — ہے عیاں معنیِ لولاک سے پایا تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰؑ کو یدِ بیضا پر — سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی — دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدیؑ سے مگر — غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں اُمّتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حالِ اُمّت کا بُرا ہو کہ بھلا، کہتے ہیں — صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں
واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ — اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا — ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں
غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا — پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں
فرقہ بندی کی ہَوا تیرے گلستاں میں چلی — یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں
شاہدِ قوم ہُوا خنجرِ بیکار سے خوں — ہائے غفلت یہ اسے رنگِ حنا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

ہو نہ اے قافلہ سالار! یہ اُمّت تیری
کارواں ہند میں ہے کوئی لُٹا کہتے ہیں

جن کی دیں داری میں ہو آرزوئے زرِ پنہاں
آکے دھوکے میں انھیں راہنما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اس نے
یہ تعصّب کو مگر گھر کا دِیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں

یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا
ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

مقصدِ لحمک لحمی پہ کھُلی ان کی زباں
یہ تو اِک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو اے شافعِ حشر
میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں

بغض لِللّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے "صلحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے
یہ اسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں

یہ دوا صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جانا ہو
درد کے حد سے گزرنے کو دوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیِ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

اُمرا جو ہیں، وہ سُنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شکوہ منت کشِ لب ہے کبھی منت کشِ چشم
مرا کہنا جو ہے رونا، تو ہے رونا کہنا

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا

بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا

ہم نے سو بار کہا قوم کی حالت ہے بُری
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

جو مرے دل میں ہے کہ دوں تو کوئی کہ دے گا
منہ پہ ہوتا نہیں ان لوگوں کو اچھا کہنا

ہم کہیں کچھ تو کہے جائیں اُنھیں کیا پروا
"کوئی" کہ دے تو اثر کرتا ہے کیا کیا کہنا

ان کی محفل میں ہے کچھ بار انھیں لوگوں کو
جن کو آتا ہو سرِ بزم لطیفا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دو عالم ہو کر

اِس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا
تنگ آ کر لبِ فریاد ہُوا وا اپنا

ایسی حالت میں بھی اُمید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعوٰی اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہنماؤں نے خراب
ہائے ان مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا

ہم تو مٹ جائیں گے معمورۂ ہستی سے مگر
صبر ان راہنماؤں پہ پڑے گا اپنا

تیری سرکار میں اپنوں کا گلہ کیا کیجے
ہو ہی جاتا ہے مصیبت میں پرایا اپنا

دیکھ اے نوحؑ کی کشتی کے بچانے والے!
آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا

ہم نے سو راہ اخوّت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہُوا اپنا، نہ پرایا اپنا

اِس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا

ہاں برس ابرِ کرم! دیر نہیں ہے اچھی — کہ نہ ہونے کے برابر ہُوا ہونا اپنا
لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے — ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا
اب جو ہے ابرِ مصیبت کا دُھواں دھار آیا — ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا
یُوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت — ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا
زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیمؑ اپنی — کر دُعا حق سے کہ مشکل ہُوا جینا اپنا
ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی — ہے انھیں لوگوں کی ہمت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنّا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو وُہ دوا کون سی ہے؟ — یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دُنیا — ہاے اے شافعِ محشرؐ! وہ دوا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے یک جان ہو اُمّت ساری — ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے؟
جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی — ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا — ناقہ وہ کیا ہے، وہ آوازِ درا کون سی ہے؟
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی — جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے؟
سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر — اپنی اُمّید یہاں تیرے سوا کون سی ہے؟
اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم! — تجھ کو جو کھینچ کے لائے، وہ ہوا کون سی ہے؟
ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی — آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے؟

میں نے پوچھا جو اخوّت کی بنا کون سی ہے؟ — تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تُو نے

راہ اس محفلِ رنگیں کی دکھا دے سب کو
اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

برگِ گُل

بر

مزارِ مقدّس حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؔ دہلوی

اقبالؔ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم ملٹری انجینیرنگ سروس میں ملازم تھے اور ۱۹۰۳ء میں بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس کے عہدے پر مامور تھے۔ مخالفین نے ان کے خلاف ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا۔ یہ زمانہ اقبالؔ کے لیے بڑی پریشانی کا تھا۔ وہ اگرچہ نقل و حرکت سے ہمیشہ متنفّر رہے لیکن بھائی کی ابتلا کا حال سُن کر خود بلوچستان پہنچے۔ کثیر روپیہ خرچ کیا۔ بلوچستان ایجنسی والے ناانصافی پر تُلے بیٹھے تھے۔ مجبُور ہو کر اقبالؔ نے براہِ راست لارڈ کرزن کی خدمت میں میموریل بھیجا۔ اس کے خاص حکم کی بنا پر شیخ عطا محمد کا دَورِ ابتلا ختم ہُوا اور وہ بری ہو گئے۔ اقبالؔ نے خود ۶ اگست ۱۹۰۳ء کے مکتوب میں مولانا حبیب الرّحمٰن خاں شروانی مرحوم کو اجمالاً یہ حالات لکھے ہیں۔ (اقبال نامہ حصّہ اوّل صفحہ ۶)

اسی دَورِ ابتلا میں اقبالؔ نے یہ نظم چھاپ کر خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے خواجہ نظام الدّین اولیاؔ کے مزار پر بھیجی اور یہ عُرس کے موقع پر پڑھی گئی۔ اس کا ایک شعر مزار شریف کے دروازے پر لکھ کر لگا دیا گیا۔ یہ ستمبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے — طُور در آغوش ہیں ذرّے تری درگاہ کے

میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا، لے اُڑا
آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے

ہے زیارت کی تمنّا المدد اے سوزِ عشق!
پھُول لا دے مجھ کو گلزارِ خلیل اللہ کے

شانِ محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق
ہائے کیا رُتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنّا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشمِ تماشا خواہ کے

رنگ اس درگہ کے ہر ذرّے میں ہے توحید کا
طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھُپ کے ہے بیٹھا ہُوا اثباتِ نفیِ غیر میں
لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں اِلّا اللہ کے

سنگِ اسود تھا مگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق
زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

عشق اس کو بھی تری درگاہ کی رفعت سے ہے
آہ یہ انجم نہیں آنسو ہیں چشمِ ماہ کے

تیرے ناخن نے جو کھولی میمِ احمد کی گرہ
کھُل گئے عقدے جہاں میں ہر خدا آگاہ کے

میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا
قیصر و فغفور درباں ہیں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال[1] کا ہم نام ہوں

سہمی پھرتی ہے شفا میرے دلِ بیمار سے
اے مسیحا دم! بچا لے مجھ کو اس آزار سے

اے ضیائے چشمِ عرفاں! اے چراغِ راہِ عشق!
تنگ آیا ہوں جفائے چرخِ ناہنجار سے

سینۂ پاکِ علیؓ جن کا امانت دار تھا
اے شہِ ذی جاہ! تُو واقف ہے اُن اسرار سے

---

[1] خواجہ محمد اقبال نامی حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین قدس سرّہٗ کے ایک مرید خاص تھے، جن پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اِس دربارِ گوہر بار سے[1]

اِک نظر میں خسروِ ملکِ سخن خسرو ہُوا
میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے

تاک میں بیٹھی ہے بجلی میرے حاصل کے لیے
بَیر ہے بادِ بہاری کو مرے گلزار سے

آج کل اصغر جو تھے اکبر ہیں اور مولا غلام
ہیں مجھے شکوے ہزاروں چرخِ کج رفتار سے

کیا کروں اوروں کا شکوہ اے امیرِ ملکِ فقر!
دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے[2]

کہہ رہے ہیں مجھ کو پر بستہ قفس میں دیکھ کر
اُڑ نہ جائے یہ کہیں پر کھول کر منقار سے

گریۂ شبنم پہ گُل ہنستے ہیں کیا بے درد ہیں
وہ جو تھی بُوئے محبت اُڑ گئی گلزار سے

گھات میں صیاد نالاں آشیاں سوزی پہ برق
باغ بھی بگڑا ہُوا ہے عندلیبِ زار سے

کر دیا تنگ آ کے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا
خامشی ممکن نہیں خو کردۂ گفتار سے

سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں ہے تیری خاکِ در مجھے
ہاں عطا کر دے مرے مقصود کا گوہر مجھے

تُو ہے محبوبِ الٰہی کر دُعا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے

ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم
چین آئے مصرِ آزادی میں پھر کیوں کر مجھے

اُس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل حضوری میں شہِ یثرب کی تُو لے کر مجھے

میرا کیا مُنہ ہے کہ اُس سرکار میں جاؤں مگر
تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے

---

[1] یہی شعر الگ لکھ کر مزار کے دروازے پر لگایا گیا تھا۔

[2] اس میں بھائی کی ابتلا کا ذکر تھا۔

واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہراؓ کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافعِ محشرؐ مجھے

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثرؐ مجھے؟

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؓ مجھے

جا ہی پہنچے گی صدا پنجاب سے دہلی تلک
کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

آہ! تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں
مُنہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

پنجاب کا جواب

پہلی جنگِ یورپ کے دوران میں مائیکل اوڈوائر پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے جہاں جنگی تنظیمات کے سلسلے میں بیسیوں اَور تدبیریں اختیار کی تھیں، وہاں مختلف اوقات میں مشاعرے بھی کرائے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے میں اوڈوائر نے اقبالؔ سے بطورِ خاص نظم لکھنے اَور مشاعرے میں آنے کی فرمایش کی تھی۔ زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس فرمایش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ نکل سکتی تھی، لہٰذا اقبالؔ نے مندرجہ ذیل نظم لکھی اَور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کے "وکیل" (امرتسر) میں یہ شائع ہوئی تھی۔

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند
روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند

محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند
تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقادِ خیر و شر | بہروز، جنگ توز، جگر سوز، سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر | آزادہ، پرکشادہ، پری زادہ، یم سپر

سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرّے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

آزادیِ زبان و قلم ہے اگر یہاں | سامانِ صلح دیر و حرم ہے اگر یہاں
تہذیبِ کاروبارِ امم ہے اگر یہاں | خنجر میں تاب، تیغ میں دم ہے اگر یہاں

جو کچھ بھی ہے عطائے شہِ محترم سے ہے
آبادیِ دیار ترے دم قدم سے ہے

وقت آ گیا کہ گرم ہو میدانِ کارزار | پنجاب ہے مخاطبِ پیغامِ شہریار
اہلِ وفا کے جوہرِ پنہاں ہوں آشکار | معمور ہو سپاہ سے پہنائے روزگار

تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہاں میں سطوتِ شاہی کا زور ہو

دیکھے ہیں میں نے سیکڑوں ہنگامۂ نبرد | صدیوں رہا ہوں میں اسی وادی کا رہ نورد
طفلِ صغیر بھی مری جنگاہ میں ہیں مرد | ہوتے ہیں ان کے سامنے شیروں کے رنگ زرد

میں نخل ہوں وفا کا، محبّت ہے پھل مرا
اس قول پر ہے شاہدِ عادل عمل مرا

ہندوستاں کی تیغ ہے فتّاحِ ہشت باب | خونخوار، لالہ بار، جگردار، برق تاب

بے باک، تابناک، گہرپاک، بے حجاب دِل بند، ارجمند، سحر خندہ سیم ناب

یہ تیغِ دل نواز اگر بے نیام ہو
دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو

اہلِ وفا کا کام ہے دنیا میں سوز و ساز بے نُور ہے وہ شمع جو ہوتی نہیں گداز

پردے میں موت کے ہے نہاں زندگی کا راز سرمایۂ حقیقتِ کُبریٰ ہے یہ مجاز

سمجھو تو موت ایک مقامِ حیات ہے
قوموں کے واسطے یہ پیامِ حیات ہے

اخلاص بے غرض ہے، صداقت بھی بے غرض خدمت بھی بے غرض ہے، اطاعت بھی بے غرض

عہدِ وفا و مہر و محبت بھی بے غرض تختِ شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض

لیکن خیالِ فطرتِ انساں ضرور ہے
ہندوستاں پہ لطفِ نمایاں ضرور ہے

جب تک چمن کی جلوۂ گُل پر اساس ہے جب تک فروغِ لالۂ احمر لباس ہے

جب تک نسیمِ صبح عنادل کو راس ہے جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومتِ آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

اہلِ درد

چند روز ہوئے اقبالؔ، گرامیؔ، اور بسملؔ تینوں حضرات ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ صاحبِ خانہ نے جو نوازش نام اور تخلص رکھتے تھے، ایک مصرع بہ ردیف "اہلِ درد" پڑھا اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ اقبالؔ نے بیان کیا تھا انھیں درد قولنج کی شکایت ہے اور اس وقت اس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل گوئی کی فرمائش ہوئی اور اقبالؔ نے بہ حالتِ درد مندرجۂ ذیل دو غزلیں اس زمین میں کہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب بسملؔ ایک فارسی قطعہ تمہیداً ان کے ساتھ لکھ کر انھیں بہ غرضِ اشاعت بھیجتے ہیں۔ (مخزن ۱۹۰۳ء)

زندگی دنیا کی مرگِ ناگہانِ اہلِ درد
موت پیغامِ حیاتِ جاودانِ اہلِ درد

بند ہو کر اور کھلتی ہے زبانِ اہلِ درد
بولتا ہے مثلِ نَے ہر استخوانِ اہلِ درد

آپ بائع، آپ ہی نقد و متاع و مشتری
ساری دنیا سے نرالی ہے دکانِ اہلِ درد

اس خموشی اور گویائی کے صدقے جائیے
محوِ شکرِ بے زبانی ہے زبانِ اہلِ درد

بیخودی میں یہ پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک
عین بیداری نہ ہو خوابِ گرانِ اہلِ درد

کہ رہی ہے ہر کلی گلزارِ ابراہیمؑ کی
آگ سے ہوتا ہے پیدا گلستانِ اہلِ درد

پالیا موسیٰؑ نے آخر بندۂ اللہ کو
درد والوں ہی کو ملتا ہے نشانِ اہلِ درد

ان کی دنیا بھی یہی، عرشِ معلّیٰ بھی یہی
دل مکانِ اہلِ درد و لامکانِ اہلِ درد

ہائے کیا محشر پہ واعظ نے اٹھا رکھی ہے بات
ہے اسی دنیا میں ہوتا امتحانِ اہلِ درد

درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی
درد سے پیدا ہوئی روحِ روانِ اہلِ درد

یہ اُجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں، مگر
ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروانِ اہلِ درد

ارتجالاً ہم نے اے اقبالؔ! کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکرِ امتحانِ اہلِ درد

صبرِ ایوبؑ و وفا خو جُزوِ جانِ اہلِ درد
گریۂ آدمؑ سرشتِ دودمانِ اہلِ درد

ہے سکوں نا آشنا طبعِ جہانِ اہلِ درد
جوں قمر سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ درد

اوج یک مشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد
جوہرِ رفعت بلا گردانِ شانِ اہلِ درد

پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظّاروں میں مست
نکہتِ گُل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ درد

ابتدا میں شرحِ رمزِ آیۂ لا تقربا[1]
کس قدر مشکل تھا پہلا امتحانِ اہلِ درد

ہم نشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں
تھی ہم آہنگ ندائے کُن، فغانِ اہلِ درد

شورشِ محشر جسے واعظ نے ہے سمجھا ہُوا
ہے وہ گلبانگِ درائے کاروانِ اہلِ درد

بُت کدے کی سمت کیوں جاتا ہے یا رب برہمن
کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہلِ درد

گرمیِ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طوف
کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہلِ درد

ذبح ہونا کوچۂ الفت میں ہے ان کی نماز
ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہلِ درد

دار پر چڑھنا نہ تھا معراج تھا منصورؔ کو
تھی وہ سولی درحقیقت نردبانِ اہلِ درد

موجِ خونِ سرمدؔ[2] و تبریزیؔ[3] و منصورؔ سے
کس قدر رنگیں ہے یا رب داستانِ اہلِ درد

---

۱ لا تقربا ھٰذہ الشجرۃ (آدمؑ اور حوّا دونوں کو حکم تھا کہ اِس درخت کے نزدیک نہ جانا)

۲ سرمد جسے دہلی میں موت کی سزا دی گئی اور اس کا مزار جامع مسجد کے عین سامنے ہے۔ اس کے قریب مولانا شوکت علی دفن ہوئے۔

۳ حضرت شمس تبریزی جو حضرت مولانا رُوم کے مُرشد تھے۔

تُو نے اے انسانِ غافل! آہ کچھ پروا نہ کی — بے زباں طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ درد

دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے ہیں یہ پنہاں اسے — کوئی کیا دیکھے گا زخمِ بے نشانِ اہلِ درد

دیکھنے والے سب سمجھتے تھے دمِ عیسیٰ جسے — تھی وہ اک موجِ نسیمِ بوستانِ اہلِ درد

پھرتے رہتے ہیں میانِ کوچۂ حبل الورید — ہے اسی آوارگی میں عزّ و شانِ اہلِ درد

کہہ دیا اقبالؔ اک مصرع نوازش نے جو آج
وہ بہانہ ہو گیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

شُکّریہ انگشتری

منشی سراج الدین جو کشمیر ریزیڈنسی میں میر منشی ہو گئے تھے، بڑے خوش ذوق اہلِ علم تھے۔ اقبالؔ سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ منشی صاحب کو فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ اقبالؔ نے ان سے کسی کے لیے انگوٹھی یا انگوٹھیاں منگوائی تھیں۔ اِس تحفے کے پہنچنے پر مندرجہ ذیل مکتوب اور اشعار بھیجے، جو منشی سراج الدین کی بیاض میں درج تھے۔ (ملاحظہ ہو اقبالنامہ)

ڈیر سراج!

دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دورۂ درد علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغان یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند اردو سطور لکھ کر "مخزن" میں بھیج دیجیے۔ والسلام۔ ۱۹۰۲ء

آپ کا اقبالؔ از لاہور

آپ نے جو مجھ کو بھیجی ارمغاں انگشتری — دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری

زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی — ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری

تو سراپا آیتے از سورۂ قرآنِ فیض ‏ ‏ وقفِ مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری[1]
میرے ہاتھوں سے اسے پہنے اگر وہ دل رُبا ‏ ‏ ہو رموزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری
ہو نہ برق افگن کہیں اے طائرِ رنگِ حنا ‏ ‏ تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری
ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس ‏ ‏ بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری
ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں ‏ ‏ ہند سے جاتی ہے سُوئے اصفہاں انگشتری

———(۵)———

یارم از کشمر فرستاد دست چار انگشتری ‏ ‏ چار در صورت بہ معنی صد ہزار انگشتری
چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل ‏ ‏ شد قبولِ دستِ یارم ہر چہار انگشتری
داغ داغ از موجِ مینا کاریش جوشِ بہار ‏ ‏ می دہد چوں غنچۂ گُل بوئے یار انگشتری
در لہاور[2] آمد و چشمِ تماشا شد تمام ‏ ‏ بود در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری
یار را ساغر بکف انگشتری در دستِ یار ‏ ‏ حلقہ اش خمیازۂ دستِ خمار انگشتری
ما اسیرِ حلقہ اش او خود اسیرِ دستِ دوست ‏ ‏ اللہ اللہ دام و صیاد و شکار انگشتری
خاتمِ دستِ سلیمانؑ حلقہ در گوشِ وے است ‏ ‏ اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری
وہ چہ بخشاید بدستِ آں نگارِ سیم تن ‏ ‏ ماند گر زیں پیشتر سر بستہ کار انگشتری
من دلِ گم گشتۂ خود را کجا جویم سراغ ‏ ‏ دزدیِ دُزدِ حنا را پردہ دار انگشتری

---

[1] یعنی اگر منشی صاحب کو فیض کا قرآن تصور کیا جائے تو انگشتری اس میں بہ لحاظ وضع و ہیئت وقفِ مطلق کی حیثیت رکھتی ہے۔

[2] لاہور کا دوسرا نام جسے امیر خسروؒ قران السعدین میں استعمال فرماتے تھے۔ (اقبالؔ)

رازدارِ دُزد ہم دُزد است در بازارِ حُسن چشمکِ دُزد حنارا رازدارِ انگشتری

ہر دو باہم ساختند و نقدِ دلہا می برند پختہ مغز انگشتِ جاناں پختہ کارِ انگشتری

نو بہارِ دل فریب انگشتری در دستِ یار بوسہ بر دستش زند بلبل و نہارِ انگشتری

بوالہوس! ز انگشتری طرزِ اطاعت یاد گیر می نہد سر بر خطِ فرمانِ یارِ انگشتری

ماہِ نو قالب تہی کرد است از حسرت بہ چرخ جلوہ فرما شد چو در انگشتِ یارِ انگشتری

ارمغانم سلک گوہر ہاست یعنی ایں غزل کز سرا جسم نورہا آمد چہارِ انگشتری

گشت اے اقبالؔ مقبولِ امیرِ ملکِ حسن[1]
کرد وا مارا گرہ آخر زکارِ انگشتری

نعت

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنّت میں دل نہ بہلا تسلّیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر

بہارِ جنّت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینہ سے آج رضواں ہزار مشکل سے اُس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

لحد میں سوتے ہیں تیرے شیدا تو حورِ جنّت کو اس میں کیا ہے کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر

تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر

شہیدِ عشقِ نبیؐ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر

---

[1] جس دوست کے لیے انگوٹھی یا انگوٹھیاں منگوائی گئی تھیں، اس شعر میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

رکھی ہوئی کام آہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے
کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے درِ شفاعت دکھا دکھا کر

ترے ثنا گر عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر

کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت
رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھپا چھپا کر

بتائے دیتے ہیں اے صبا ہم یہ گلستانِ عرب کی بو ہے
مکر نہ اب ہاتھ لا اِدھر کو وہیں سے لائی ہے تو اُڑا کر

تری جدائی میں مرنے والے فنا کے تیروں سے بے خطر ہیں
اجل کی ہم نے ہنسی اُڑائی اسے بھی مارا تھکا تھکا کر

ہنسی بھی کچھ کچھ نکل رہی ہے، مجھے بھی محشر میں تاکتی ہے
کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتابِ عمل اُٹھا کر

یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے
دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں مُنہ چھپا کر

شہیدِ عشقِ نبیؐ ہوں میری لحد میں شمعِ قمر جلے گی
اُٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر

جسے محبّت کا درد کہتے ہیں، مایۂ زندگی ہے مجھ کو
یہ درد وُہ ہے کہ میں نے رکھا ہے دل میں اس کو چھپا چھپا کر

خیالِ راہِ عدم سے اقبالؔ تیرے در پر ہُوا ہے حاضر
بغل میں زادِ عمل نہیں ہے صِلہ مری نعت کا عطا کر

معراج

ہر دو جہاں میں ذکرِ حبیبِ خدا ہے آج
ہر ذرّے کی زبان پہ صلّی علیٰ ہے آج

معراجِ مصطفےٰ سے کھلا عقدۂ حیات
رُوحِ نبیؐ میں جلوۂ رُوحِ خدا ہے آج

قوسین میں ثبوت ہے اس جذب و شوق کا
ہر لمحہ ذکر و فکر میں درسِ بقا ہے آج

وہ بزمِ ناز، وہ گُل و بُلبُل کی خلوتیں
الفت میں امتیازِ من و تو فنا ہے آج

اِک جست ہی میں طے ہیں دو عالم کی وسعتیں
اور رشتۂ زمان و مکاں کٹ گیا ہے آج

طائر حریم قدس کے سب نغمہ سنج ہیں
روح الامیں بھی شوق سے مدحت سرا ہے آج

جو منتظر ازل سے تھا اس کے قدم کا
بہرِ نبیؐ وہ گنبدِ بے در کھلا ہے آج

حوریں خوش آمدید پکاریں بہشت میں
از فرش تا بہ عرش صدا مرحبا ہے آج

یہ رات وہ ہے جس پہ کرے رشک دن کا نور
سایہ ہر ایک سایہ بالِ ہما ہے آج

عشقِ نبیؐ میں قبلہ نما سے ہوں بے نیاز
نورِ یقیں سے قلب ہی قبلہ نما ہے آج

اقبالؔ آ کہ پھر اسی چوکھٹ پہ جھک پڑیں
آغوشِ رحمت اس کی اسی طرح وا ہے آج

جوہرِ ایمانؔ

چشمِ باطل پہ عیاں جوہرِ ایماں کر دے
دے کے ذرّوں کو جلا مہرِ درخشاں کر دے

دَور پھر آیا ہے مسلم کی جہاں بانی کا
دفترِ کفر کو دُنیا میں پریشاں کر دے

عام کی عقل نے یاں وہم و گماں کی ظلمت
شمعِ ایماں کو سینوں میں فروزاں کر دے

ہے محبت میں وہ قوت کہ بنے سنگ بھی موم
حُسنِ اخلاق سے کافر کو مسلماں کر دے

ذرّے ذرّے کو بنا وسعتِ صحرا کا امیں
پردۂ جہل اٹھا اپنی خودی سے غافل
اس کی پوشیدہ خدائی کو نمایاں کر دے

عہدِ حاضر ہے جہنم تو مسلماں ہے خلیل
نورِ ایقان سے آتش کو گلستاں کر دے

خوفِ شر کیوں ہو اگر خیر ہے مقصد تیرا تری تسخیر تو ابلیس کو سوزاں کر دے

دل کو مایوس نہ کر رحمتِ حق سے اقبالؔ

مرغِ افسردہ کو پھر اپنے غزل خواں کر دے

خطاب بہ مُسلم

نورِ توحید سے گر قوتِ بیدار ہے تُو

اپنی قسمت کا یہاں آپ ہی مختار ہے تُو

حق کے ہوتے ہوئے باطل سے ہراساں کیوں ہے؟

گردنِ کفر پہ چلتی ہوئی تلوار ہے تُو

تیری ہستی ہی پہ موقوف ہے نظمِ عالم

دستِ قُدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے تُو

ذرّے ذرّے میں جلا ہے تری تکبیروں سے

ظلمتِ دہر میں اِک مطلعِ انوار ہے تُو

ہو یقیں مُردہ تو ہے سنگ بھی تجھ سے بہتر

ہو یقیں زندہ تو پھر حیدرِ کرّار ہے تُو

حق ہی کہ حق ہی نے قوموں کو اُبھارا اقبالؔ

حق ہے سینے میں ترے مخزنِ اسرار ہے تُو

سپاسِ جنابِ امیرؓ

یہ نظم جنوری ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ تمہیدی نوٹ سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اہلِ ذوق مدیر "مخزن" کو لکھا کرتے تھے کہ اقبالؔ کا فارسی کلام بھی شائع کیجیے۔ احباب کے اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقبالؔ نے مندرجۂ ذیل نظم اشاعت کے لیے عنایت فرمائی۔ اُس زمانے میں اقبالؔ یہ نظم بہ غرضِ اظہارِ عقیدت صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ ("مخزن" بابت جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴۷، ۴۸)

اے محوِ ثناے تو زبانہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا

اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت

اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں
تفسیرِ تو سورہ ہاے قرآں

اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے

اے سرِّ نبوّتِ محمدؐ
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

گردوں کہ بہ رفعت ایستادست
از بامِ بلندِ تو فتادست

ہر ذرّہ در گہت چو منصور
در جوشِ ترانۂ انا الطور

بے تو نتواں بہ او رسیدن
بے او نتواں بہ تو رسیدن

فردوس ز تو چمن در آغوشش
از شانِ تو حیرت آئنہ پوشش

جانم بہ غلامیِ تو خوشتر
سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر

ہشیارم و مستِ بادۂ تو
چوں سایہ ز پا فتادہ، تو

از ہوش شدم مگر بہ ہوشم ۔ گوئی کہ نصیری خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است ۔ در پردۂ خامشی نیاز است
امّا چہ کنم مئے تولّا ۔ تند است بروں فتد ز مینا
ز اندیشۂ عاقبت رہیدم ۔ جنسِ غمِ آلِ تو خریدم
فکرم چو بجستجو قدم زد ۔ در دیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم ۔ دامن چوں گرد باد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ ۔ صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بہ روے کارم ۔ شرمندۂ دامنِ غبارم
پویاں پے خضر سوے منزل ۔ بر دوشِ خیال بستہ محمل
جویاے مے و شکستہ جامے ۔ چوں صبح بہ باد چیدہ دامے
پیچیدہ بہ خود چو موجِ دریا ۔ آوارہ چو گرد بادِ صحرا
واماندہ ز دردِ نارسیدن ۔ در آبلہ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاہ ۔ از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت ۔ بُت خانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بہ خرمنم گزر کرد ۔ از لذّتِ سوختن خبر کرد
برباد متاعِ ہستیم داد ۔ جامے ز مئے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم ۔ چوں عکس ز خود جدا فتادم

پیراہن ما و من دریدم
چوں اشک ز چشمِ خود چکیدم

خاکم بہ فرازِ عرش بُردی
زاں راز کہ با دلم سپردی

واصل بہ کنار، ہستیم شد
طوفانِ جمال زِ ہستیم شد

جُز عشق حکایتے ندارم
پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

پیشکش

(بحضور سر سیّد علی امام مرحوم)

اشعارِ ذیل "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن میں بہ طریقِ انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے، مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔ یہاں کل اشعار یک جا پیش کیے جاتے ہیں۔

اے امام، اے سیّدِ والانسب
دودمانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیِ بیگانۂ
جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ

مُرغِ فکرم گلستاں ہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام

بود نقشِ ہستیم انگارۂ
ناقبولے، ناکسے، ناکارۂ

عشق سوہان زد مرا آدم شدم — عالمِ کیف و کمِ عالم شدم
حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام — در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات
من کہ ایں شب را چو مہ آراستم — گردِ پائے ملّتِ بیضاستم
ملّتے در باغ و راغ آوازہ اش — آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش
ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطّار کرد
آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم — گرچہ دودم از تبارِ آتشم
خامہ ام از ہمّتِ فکرِ بلند — راز ایں نُہ پردہ در صحرا فگند
قطرہ تا ہمپایۂ دریا شود — ذرّہ از بالیدگی صحرا شود
ملّت را جسم است شاعر چشمِ اوست — جسم را از چشمِ بینا آبروست
چشمم از نورِ محبّت روشنم — اشک بار از دردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

("اسرارِ خودی" پہلا ایڈیشن)

حافظ شیرازی

"اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن میں جہاں افلاطون کو "گوسفندانِ قدیم" میں سے کہا تھا، وہاں خواجہ حافظؔ کو بھی اسی گروہ میں شامل کیا تھا۔ حافظؔ کے متعلق چونکہ متصوفین میں ایک خاص تقدس کا عقیدہ موجود تھا اس کی وجہ سے اقبالؔ پر اعتراضات شروع ہو گئے بلکہ دہلی کے ایک صاحب نے نیز امرتسر کے ایک بزرگ نے اقبالؔ کے خلاف نظمیں لکھ کر چھاپ دیں گویا بالکل ویسی ہی صورت پیش آئی جیسی میرزا غالبؔ کو "قاطع برہان" لکھ کر پیش آئی تھی۔ اقبالؔ نے جب دیکھا کہ لوگوں کی توجہ اصل بحث سے ہٹ کر اس معاملے کی طرف منعطف ہو گئی ہے جس سے اقبالؔ کی تعلیم کو کوئی تعلق نہ تھا تو انھوں نے یہ اشعار حذف کر دیے اور ان کی جگہ "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیاتِ اسلامیہ" کے باب کا اضافہ کر دیا اس لیے کہ مقصود نہ یہ تھا کہ حافظؔ کی مذمت ہو، نہ یہ تھا کہ عرفیؔ کی تعریف کی جائے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں پر واضح ہو جائے کس قسم کی ادبیات کے مطالعے سے قوموں میں خودی اور خودداری پیدا ہوتی ہے یا اسے تقویت پہنچتی ہے۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ او　　مے علاجِ ہولِ رستا خیزِ او
نیست غیر از بادہ در بازارِ او　　از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں حباب از بادہ گلگوں شود　　مایہ دارِ حشمتِ قاروں شود
مفتیٔ اقلیمِ او مینا بدوش　　محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
طوفِ ساغر کردہ مثلِ رنگِ مے　　خواست فتویٰ از رباب و چنگ و نے
در رموزِ عیش و مستی کاملے　　از خُمے خوں در دلے، پا در گلے

رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت — بزمِ رندان و مئے باقی گذاشت
چوں جرس صد نالهٔ رسوا کشید — عیش هم در منزلِ جاناں ندید
در محبت پیروِ فرهاد بود — بر لبِ او شعلهٔ فریاد بود
تخمِ نخلِ آه در کهسار کاشت — طاقتِ پیکار با خسرو نداشت
مسلم و ایمانِ او زنّار دار — رخنه اندر دینش از مژگانِ یار
آنچناں مستِ شرابِ بندگی ست — خواجه و محرومِ ذوقِ خواجگی ست
دعویِ او نیست غیر از قال و قیل — "دست او کوتاه و خرما بر نخیل"
آں فقیهِ ملتِ مے خوارگاں — آں امامِ امتِ بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — عشوه و ناز و ادا آموخت است
دلربائی هائے او زهر است و بس — چشمِ او غارت گرِ شهر است و بس
ضعف را نامِ توانائی دهد — سازِ او اقوام را اغوا کند
از بزِ یونان زمینِ[1] زیرک تر است — پردهٔ عودش حجابِ اکبر است
نغمهٔ چنگش دلیلِ انحطاط — هاتفِ او جبرئیلِ انحطاط
بگذر از جامش که در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن[2] دارد حشیش
از تخیل جنتے پیدا کند — مر ترا بر نیستی شیدا کند
ناوک اندازے که تاب از دل برد — ناوکِ او مرگ را شیریں کند
مار گلزارے که دارد زهرِ ناب — صید را اوّل همی آرد به خواب

---

[1] یعنی افلاطون [2] حسن بن صباح

عشق با سحرِ نگاہش خود کُشی ست
کشمکش مشکل کہ مارِ خانگی ست

حافظِ جادو بیاں شیرازی است
عرفیِ آتش زباں شیرازی است

ایں سوے ملکِ خودی مرکب جہاند
آں کنارِ آبِ رکن آباد ماند

ایں قتیلِ حکمتِ مردانہ
آں ز رمزِ زندگی بیگانہ

دست ایں گیرد ز انجم خوشہ
چشمِ آں از اشک دارد توشہ

روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر
عرفیا! فردوس و حورا و حریر

غیرتِ او خندہ بر حورا زند
پشت پا بر جنتِ الماویٰ زند

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز
زندہ؟ از صحبتِ حافظ گریز

ایں فسوں خواں زندگی از ما ربود
جامِ او شانِ جمی از ما ربود

محفلِ او درخورِ ابرار نیست
ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

(مثنوی اسرارِ خودی پہلا ایڈیشن)

خطاب بہ تاجدارِ دکن

اقبالؔ نے اپنی دوسری مثنوی "رموزِ بے خودی" کا ایک نسخہ تاجدارِ دکن کی خدمت میں بھیجا تو اس کے ساتھ یہ اشعار بھی ارسال کیے تھے:

اے مقامت برتر از چرخِ بریں — از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
جلوۂ صدیقؓ از سیمائے تو — حافظِ با تیغ جوشن خائے تو
از تو مارا صبحِ خنداں شامِ ہند — آستانت مرکزِ اسلامِ ہند
دوشِ ملّت[1] زندہ از امروزِ تو — تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تو
بندگانستیم ما تو خواجۂ — از پئے فردائے ما دیباجۂ
گوہرم را شوخیش بے باک کرد — تا گریبانِ صدف را چاک کرد
پیشِ سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

(کلیاتِ اقبال مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۸۵، ۸۶)

---

[1] مراد یہ ہے کہ اسلامیوں کا ماضی آپ کی وجہ سے زندہ ہے۔

افغان و امان

خطاب بہ ملّت افغانیہ

۱۹۲۸ء میں شاہ امان اللہ خاں فرمانروائے کابل کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکی اور افغانستان میں خوفناک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تو اقبالؔ نے پے در پے تین نظمیں ملّتِ افغانیہ کے لیے لکھیں، جو روزنامہ "انقلاب" کے تین ہفتہ وار ایڈیشنوں میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے پہلی نظم یہ تھی:

ملّتِ افغاں مقامِ خود شناس — در جہاں رمزِ دوامِ خود شناس
تو مثالِ شعلہ، من مثلِ شرر — برگ و سازِ من متاعِ یک نظر
ایں نگہ را مستعار از من بگیر — تا رواں اندر بدن گردد بصیر
از فریبِ روزگار آگاہ شو — روشن از تابِ امان اللہ شو
در جبینِ او خطِ تقدیرِ تست — اے سراپا نالہ! او تاثیرِ تست
روحِ مشرق را نمود از پیکرش — مثلِ گردوں حادثات اندر برش
مر ترا بر خویشتن شیدا کند — از قبائل ملّتے پیدا کند
یک دو جام از دستِ ایں ساقی بگیر — زیں جواں ساقی مئے باقی بگیر
اے ترا دولت خداداد است خیز — فتنہ اندر کابل آزاد است خیز
مردِ مومن را زوال از کثرت است — حکم و علمش را کمال از وحدت است

جانِ خود را وارہاں از پیچ و تاب
وحدتِ گم گشتۂ خود باز یاب

خطاب بہ امان اللہ

در نگر اے خسروِ صاحب نظر — نیست ہر سنگے کہ می تابد گہر
مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد — سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد
"ہر ہلاکِ اُمّتِ پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بُردند عود"
مصطفیٰ[1] کو از تجدّد می سرود — گفت نقشِ کہنہ می باید زدود
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت — مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت
طرفگی ہا در نہادِ کائنات — نیست از تقلید تقویمِ حیات
زندہ دل خلّاقِ اعصار و دہور — جانش از تقلید گردد بے حضور
زانکہ تقلید است مرگِ تازۂ — مردہ دختر را چہ سود از غازۂ
اے امان اللہ اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
غوطہ چوں در قعرِ ایں دریا زنند — فرشیاں با عرشیاں صہبا زنند
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست — صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

---

[1] مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک۔

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانِ دیگرش[1]

خطاب بہ علماءِ حق

ملتِ افغانیہ سے خطاب کے سلسلے کی دوسری نظم ہے۔ اس میں خاص خطاب افغانستان کے علمائے حق سے ہے۔

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است
در نگاہِ او یمِ ما شبنم است

از شگرفیہائے آں قرآں فروش
دیدہ ام روح الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ
نزدِ او اُمّ الکتاب افسانۂ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ
آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و اقولش فرد فرد

لب بہ تکفیرِ امان اللہ کشاد
چوں شرر در آشیانِ خود فتاد

ملتے ناموس را از کف دہد
سطوتِ کاؤس را از کف دہد

فتنہ از ما نیست از ملّائے ماست
ایں جنوں ہا از جنوں فرمائے ماست

---

[1] روزنامہ "انقلاب" ۳۔ فروری ۱۹۲۹ء۔ یہ اشعار بعد ازاں جزوی ترمیم سے جاوید نامہ میں شامل کر لیے گئے

اے ز افکارِ تو مومن را عروج		بر امان اللہ روا داری خروج؟
حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست		حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست
تو کلیمی چند باشی سر نگوں		دستِ خویش از آستیں آور بروں
سرگزشتِ ملتِ بیضا بگو		با غزال از وسعتِ صحرا بگو

فطرتِ تو مستنیر از مصطفےٰ است
باز گو آخر مقامِ ما کجا است

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو		مردِ حق از حق پزیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر		ہر زماں او را چو حق شانے دگر
راز ہا با مردِ مومن باز گوے		رمز حرف "کل یوم"[1] باز گوے
جز حرم منزل نہ دارد کارواں		غیرِ حق در دل نہ دارد کارواں"

من نمی گویم کہ راہش دیگر است
کارواں دیگر نگاہش دیگر است

غیر را عیش و نشاطِ متصل		ما ملول و دردمند و مضمحل
غیر اندر شہر و دہ بے احتیاج		ما و کشتِ نابہ سامان و خراج
غیر در کارِ اخوت گرم خیز		ما برادر با برادر در ستیز
اصلِ غیر از میش و کارش چوں پلنگ		اصلِ ما از شیر و کارِ ما چو رنگ[2]

---

[1] کل یوم ہو فی شان۔ [2] بکری۔

هر کسے بر جادهٔ خود تند رَو — ناقهٔ ما بے زمام و هرزه دَو
صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب — العجب، ثم العجب، ثم العجب

خیز و سوزِ سینه با احرار ده
دهرِ دوں را گرمیِ رفتار ده[1]

خطاب به اقوامِ شرق

یہ خطاب بہ ملتِ افغانیہ کے سلسلے کی تیسری اور آخری نظم ہے

در نهادِ ما تب و تاب از دل است — خاک را بیداری و خواب از دل است
تن ز مرگِ دل دگرگوں می شود — در مساماتش عرق خوں می شود
روزگارش آں چناں زیر و زبر — از غروبِ آفتاب او را سحر
آرزوها در ضمیرش بے ستیز — مرده و هم ناامید از رستخیز

از فسادِ دل بدن هیچ است هیچ
دیده بر دل بند و جز بر دل مپیچ

آسیا یک پیکرِ آب و گل است — شهرِ کابل اندریں پیکر دل است
از فسادِ او فسادِ آسیا — در کشادِ او کشادِ آسیا

---

[1] روزنامہ "انقلاب" مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء۔ یہ نظم بھی بعد ترمیم "جاوید نامہ" میں شامل ہو گئی۔

گرفتہ در گردنِ او بندِ کس　　حالِ تو اللہ بس باقی ہوس

تا دل آزاد است آزاد است تن

ورنہ کاہے در رہِ باد است تن

گیر دامانِ امان اللہ را　　او جواں مرد است و داند راہ را

کاروانت را درا از رنگ و بُوست　　زانکہ او را ذوق و شوق از جستجوست

تابِ او از آفتابِ خاور است　　رنگ و آبش رنگ و آبِ خاور است

رُوحِ شرق از تندی و تیزی چو برق　　مُرد از بے ربطیِ اقوامِ شرق

شرمسار آبائے ما از کارِ ما　　کارِ ما، افکارِ ما، آزارِ ما

فصلِ اقوامِ آدمیت را زوال　　وصلِ اقوامِ آدمیت را کمال

افتراق از مرگ و مرگ از افتراق　　اتّفاق اے اتّفاق، اے اتّفاق

اُمتاں را زندگی حریّت است

حریّت پروردۂ جمعیّت است

غربیاں را زیرکی سازِ حیات　　شرقیاں را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود　　نقش بندِ عالمِ دیگر شود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیز دہ

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است　　چشمِ شاں صاحب نظر، دل مردہ است

زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش — بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں — عصرِ دیگر نیست در ادراکِ شاں
زندگی را سوز و ساز از نارِ تُست — عالمِ نو آفریدن کارِ تُست

اے خدا بیں خویشتن را ہم نگر
بحر را در قطرۂ شبنم نگر[1]

فلاحِ قوم

یہ نظم طالب علمی کے زمانے کی ہے اور "انجمن کشمیری مسلماناں" میں پڑھی گئی تھی جو فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری نے شادی وغمی کے رسوم کی اصلاح نیز تعلیم وتجارت وغیرہ کی ترقی کے لیے قائم کی تھی۔

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں — بدن میں جان تھی جیسے قفس میں صیدِ زبوں
چڑھائی فوجِ الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی — عَلَم خوشی کا مرے دل میں ہو گیا تھا نگوں
کیا تھا کُوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے — لگائے خیمہ تھے واں رنج کے جنود و فنوں
غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی اک آگ — بنا ہوا تھا مرا سینہ رشکِ صد کانوں
زبسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے — یہ فکر بسکہ لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں
جو سامنے تھی مرے قوم کی بُری حالت — اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں
انہی غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی — کہ بیت قوم کی اصلاح سے ہوئی موزوں

---

[1] روزنامہ "انقلاب" مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۲۹ء، آخری بند کے اشعار "جاوید نامہ" میں لے لیے گئے۔

پئے مریض یہ اک نسخۂ مسیحا تھا — کہ جس کو سن کے ہوا خرمی سے دل مشحوں
غبار دل میں جو تھا کچھ فلک کی جانب سے — دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قاروں
ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم — یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالعِ واژوں
ملے گا منزلِ مقصود کا پتہ ہم کو — خدا کا شکر ہے جس نے دیئے یہ راہنموں
ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں — ادا نہ پھر بھی ہو شکرِ خدائے کُن فیکوں
مثالِ شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں — نہ طے ہو زلفِ رہِ شکرِ ایزدِ بےچوں
چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک — چمن ہوئی مرے سینے میں نارِ سوزِ دروں
یہ کیا خوشی ہے کہ دل خود بخود یہ کہتا ہے — بعید رنج سے اور خرمی سے ہوں مقروں
خوشی سے آ کے خدا جانے کیا کہا اس نے — اچھل رہا ہے مثالِ تموّجِ جیحوں
کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی — کہ حصنِ قوم ہر اک شر سے ہو گیا ہے مصوں
خدا نے ہوش دیا متفق ہوے سارے — سمجھ گئے ہیں تری چال گنبدِ گردوں
چراغِ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں — ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا دُرِ مکنوں
مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے — جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں
بڑھے یہ بزم ترقی کی دَوڑ میں یارب — کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں
اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے — وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستوں
دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو — ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں
جو دَوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں — سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں

کچھ ان میں شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے ہماری قوم پہ یا رب وہ پھونک دے افسوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہنر یہ اوروں کو زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں
جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اُسے بھی باندھ لے اقبالؔ! بصورتِ مضموں

ہم نہ چھوڑیں گے دامن

سراپا ہوا مثلِ آغوشِ دریا نہانے کو اُترا جو وہ رشکِ گلشن
پے، دید کھولیں حبابوں نے آنکھیں اٹھائی نظارے کو موجوں نے گردن
اسیر خمِ زلف کیوں کر نہ ہو خضر یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن
خمِ زُلف موجوں نے آکر اڑائے غضب ہے، پڑے رہزنوں کو بھی رہزن
ادھر سر حبابوں نے ساحل سے ٹپکے نہا کر جو نکلا وہ دریا سے پُرفن
ہوئی خوں فشاں چشمِ گرداب ایسی کہ دریا ہوا غیرتِ صحنِ گلشن
جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا کہا میں نے اے رو کشِ شمعِ روشن
کہیں آگ سے بھی ٹپکتا ہے پانی بجا ہے جو کہتے تجھے ساحری فن
مری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے
صنم چھوڑ دے ہم نہ چھوڑیں گے دامن

منشی محبوب عالم کے سفرِ یورپ پر

یہ نظم منشی محبوب عالم صاحب مالک "پیسہ اخبار" لاہور کے سفرِ یورپ پر تشریف لے جانے کے موقع پر، انجمن حمایت اسلام کے جلسہ منعقدہ ۲۵ مئی سنہ ۱۹۰۰ء میں پڑھی گئی اور اس جلسے کی روئداد میں شائع ہوئی۔

اس میں شیخ عبدالقادر نے اس نظم کے متعلق لکھا

"اختتام جلسہ پر جب صرف پندرہ بیس اصحاب باقی رہ گئے تھے معلوم ہُوا کہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے جن کے اشعار کو کچھ عرصے سے قبولیت خاص حاصل ہے ایک نظم پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا افسوس رہا کہ ان کی نظم پہلے کیوں نہ پڑھی جا سکی۔ بہرحال وہ نظم بھی پڑھی گئی اور سامعین نے بہت داد دی۔"

لیجیے حاضر ہے مطلعِ رنگیں — جس پہ صدقے ہو شاہدِ تحسیں
سوئے یورپ ہوئے وہ راہ سپر — مفت میں ہو گیا ستم ہم پر
آنکھ اپنی ہے اشکِ خوں میں سے — غیرتِ کاسۂ مئے احمر
فتحِ ملکِ ہنر کو جاتے ہیں — ہمرکابی کو آ رہی ہے ظفر
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے — کھینچ کر لے چلا ہے ذوقِ نظر
فخرِ انساں کا ہے تلاشِ کمال — جستجو چاہیے مثالِ قمر
خوب تاڑا ہے سیر کا موقع — نکتہ بیں چاہیے نگاہِ بشر
سیرِ دریا میں ہیں ہزار مزے — جس کو دکھلائے خالقِ اکبر
وہ شرِ بحر کی موجیں — مہر کا وہ خرام پانی پر

اور وہ چاندنی کہ بحر جیسے — اوڑھ لیتا ہے صورتِ چادر
دی خبر آپ نے یہ کیا ناگاہ — چپکے چپکے چبھو دیا نشتر
دوستوں کا فراق قاتل ہے — درد اُٹھا ہے صورتِ محشر
آنکھ میں ہیں، نہیں رواں لیکن — اشک اپنے ہیں مثلِ آبِ گہر
جائیے اور پھر کے آئیے گا — صورتِ بُوئے نافۂ اذفر
اِس طرح راہ آنکھ دیکھے گی — جوں مؤذن کو انتظارِ سحر
بزمِ یاراں رہے گی یوں خاموش — جیسے چُپ چاپ شام کو ہوں شجر
سرِ مژگاں پہ آ گئے آنسو — نکل آیا جو دل میں تھا مضمر
مدحِ احباب فرض انساں ہے — لاؤں اس کے لیے میں خامۂ زر
یاں خموشی گناہ ہے ایسی — جس طرح کفر ہجوِ پیغمبر

یہ سفر آپ کو مبارک ہو
یہ حضر آپ کو مبارک ہو

آپ ہیں محوِ سَیرِ دریائی — چشمِ احباب غم سے بھر آئی
رقص موجوں کا جا کے دیکھیں گے — بھیج دی ہے جہاز کو سائی
لطف اخبار کا جب آتا ہے — بزمِ یورپ سے ہو شناسائی
دمِ رخصت وہ گرم جوشی ہے — آتشِ عشق جس سے شرمائی
کسی کونے میں تاکتی ہے اسے — گرمیِ آفتاب جولائی

لب سے نکلا کہ فی امان اللہ　　　فخر کرتی ہے تابِ گویائی
نشۂ دوستی چڑھا ایسا　　　شعر میں بھی ہے رنگِ صہبائی
آب آئینہ پر گراتے ہیں　　　"بملامت روی و باز آئی"
عزمِ پنجاب ہو مگر جلدی　　　کہ نہیں طاقتِ شکیبائی
ہو نہ محبوب سے جدا کوئی　　　اے رگِ جانِ عالم آرائی[1]
الغیاث اے معلّمِ ثالث[2]　　　دردِ فرقت سے جان گھبرائی
ایسی پڑیا کوئی عنایت ہو　　　دل سے اُٹھے کہ وہ شفا پائی
آگیا بحر چپ رہو اقبالؔ　　　خامہ کرتا ہے عذر بے پائی
توبہ کرلی ہے شعر گوئی سے　　　اس کی قیمت پڑی نہ اِک پائی
شعر سے بھاگتا ہوں میں کوسوں　　　ہے یہ توحید اور میں عیسائی
"آں چہ دانا کند کند ناداں　　　لیک بعد از ہزار رسوائی"

دوستوں کی رہے دُعا حافظ
ہو سفر میں ترا خدا حافظ

---

[1] اس شعر میں "محبوب عالم" نام لایا گیا ہے۔　[2] معلّم ثالث بو علی سینا جو مشہور فلسفی اور طبیب تھے۔ یہاں ان کی طبابت کی طرف اشارہ ہے۔ معلّم اول ارسطو اور معلّم ثانی ابو نصر فارابی۔

شیشۂ ساعت کی ریگ

اے مُشتِ گردِ میداں، اے ریگِ سرخِ صحرا
کس فتنہ جو نے تجھ سے دشتِ عرب چھڑایا

صرصر کے دوش پر تُو اُڑتی پھری ہے صدیوں
بلّور کے مکاں میں کرتی ہے اب بسیرا

ہے خار زارِ غربت تیرے لیے یہ شیشہ
قصرِ بلور جس کو میری نظر نے سمجھا

تیرے سکوت میں ہے سو داستاں پرانی
عہدِ کہن بھی گویا دیکھا ہُوا ہے تیرا

اس دن کی یاد اب تک باقی ہے تیرے دل میں
کنعاں کا قافلہ جب سوئے حجاز آیا

دیکھے ہوئے ہیں تیرے فرعون کے سپاہی
تو ہو چکی ہے شاید پامال قوم موسےٰ

چومے تھے تو نے اُڑ کر مریمؑ کے پائے نازک
ٹوٹا جو ناصرہ کی تقدیر کا ستارا

شاید گواہ ہے تو اس روز کے ستم پر
یثرب کا چاند جس دم اپنے وطن سے نکلا

ہو کس طرح بھلا تو اس نقشِ پا سے غافل
جس نے ترے وطن کو جنت بنا دیا تھا

اے ریگِ سرخ تیرا ہر ذرّہ کہہ رہا ہے
میں جانتا ہوں قصہ میدانِ کربلا کا

تو گردِ پا ہے شاید بصرہ کے زائروں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرہ ہے شناسا

طرزِ نفس شماری شیشے سے تو نے سیکھی
جاسوس بن گئی تو اقلیم زندگی کی [1]

۱؎ خدنگ نظر بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء۔

باقیاتِ بانگِ درا

ہمالہ

یہ نظم "مخزن" کے سب سے پہلے نمبر (اپریل ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بارہ بند تھے۔ نظرثانی میں بعض بند حذف کر دیئے۔ بعض میں جزوی ترمیم کر دی۔ بعض کے مصرعوں میں تقدّم و تاخر مناسب سمجھا۔

متروکہ بند

وہ اچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اک نور کی
جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دل لگی کرتی ہے ہر پتّی سے جس کی روشنی
میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ اور ہی
دل کی تاریکی میں وہ خورشید جاں افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اصولِ[1] حق نمائے نفیِ ہستی کی صدا
روح کو ملتی ہے جس سے لذّتِ آبِ بقا
جس سے پردہ روئے قانونِ محبت کا اٹھا
جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا
تیرے دامن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیج جس کی ہند میں ہے، چین و جاپاں میں ثمر

---

[1] اشارہ ہے بدھ مت کی طرف۔

تُو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا	کچھ بتا اُن رازدارانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا	تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہِ المپس[1] کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراسر چشمِ بینا کے لیے[2]

آنکھ اے دل کھول اَور نظّارۂ قدرت کو دیکھ	اس فضا کو، اس گل و گلزار کی زنگت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اَور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ	اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاھدِ مطلب ملے جس سے، وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے، وہ درماں ہے یہی

ظاہر ہے یہ بند صرف اس لیے ترک کیے گئے کہ اسلوب بیان معیاری نہ تھا۔

"بانگِ درا" میں شائع شدہ نظم کا تیسرا بند پہلے یُوں تھا:

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موج زن	رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن	چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن

چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

---

[1] یونان کا مشہور پہاڑ جس پر یونانیوں کے عقیدے کے مطابق دیوتاؤں کے دربار ہوتے تھے۔

[2] یہ شعر نظرِ ثانی میں قائم رکھا اور اسے پہلے بند کی ٹیپ بنا دیا۔

بند اوّل کی ٹیپ کا شعر پہلے یوں تھا:

تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

اِس بند کا دوسرا شعر پہلے یوں تھا:

تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں

ابتدا میں دوسرے بند کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع پیچھے تھا اور پچھلا پہلے۔

پانچویں بند کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع یوں تھا:

جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گُل کی کلی

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں "گویا ہے" کی جگہ "کہتی ہے" تھا۔

چھٹے بند کے پہلے دو شعر یوں تھے:

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی — آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی لہروں کو شرماتی ہوئی — ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی

گُلِ رنگیں

یہ نظم مئی ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کے چھ بند تھے، جن میں سے دو حذف کر دیئے، باقی بندوں میں بھی خاصی ترمیم ہوئی۔

متروکہ بند

آہ اے گُل! تجھ میں بھی جوہر وہی مستور ہے
جو دلِ انساں میں مضمر مثلِ موجِ نُور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے
ہائے پھر مجھ سے جدائی کیوں تجھے منظور ہے
دل میں کچھ آتا ہے، لیکن منہ سے کہہ سکتا نہیں
اور تکلیفِ خموشی کو بھی سہہ سکتا نہیں

بھا گئے انداز تیرے اے گُلِ رعنا مجھے
مار ڈالے گا خوشی سے جھُومنا تیرا مجھے
کیوں نہیں ملتی یہ تسکینِ قرار افزا مجھے
ہاں سکھا دے کچھ سبق اپنی خموشی کا مجھے
باغِ ہستی میں پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

پہلا بند ابتدا میں یوں تھا

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
واقفِ افسردگی ہائے طپیدِ دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں
کیوں یہ تسکینِ خموشی زا بمجھے حاصل نہیں
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

دوسرے بند کی ٹیپ کا شعر یوں تھا:

آشنائے سوزِ فریادِ دلِ مہجور ہوں
پھول ہوں میں بھی، مگر اپنے چمن سے دور ہوں

آخری بند یوں تھا:

یہ پریشانی مگر جمعیتِ عرفاں نہ ہو — یہ حنا بندِ کفِ محبوبۂ ایماں نہ ہو
یہ خزاں اپنی بہارِ گلشنِ رضواں نہ ہو — یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ انساں نہ ہو
ہے یہ تاریکی مگر اک شمعِ دل افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

عہدِ طفلی

یہ جولائی ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں چھپی تھی اور اس کے پانچ بند تھے۔ دو بند ابتدائی اور ایک آخری نظرثانی میں حذف کر دیے، جو ذیل میں درج ہیں:

ہاں اٹھا اے ساحرِ ایام! یہ جادو ذرا — ابلقِ گردوں نہ ہو محوِ رمِ آہو ذرا
ہائے پھر آ جا کہیں سے عمرِ رفتہ! تو ذرا — لا وہ نظارہ پئے چشمِ تماشا جو ذرا
خون رلواتے ہیں ایامِ جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایامِ طفلی کے مزے

ہاے وہ عالم کہ عالم گیر تھی اپنی ادا — غیرتِ صد فصلِ گُل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتبِ طفلی میں غیر از درسِ آزادی نہ تھا — رنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا
مایۂ دارِ صد مسرّت اک تبسّم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر، وہ تکلّم تھا مرا

آہ اے دنیا نمک پاشِ خراشِ دل ہے تُو — جس کے ہر دانے میں سو بجلی ہو، وہ حاصل ہے تُو
جو مسافر سے پرے رہتی ہے، وہ منزل ہے تُو — جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو، وہ محمل ہے تُو
تیرے ہاتھوں کوئی جو پائے مئے تسکیں نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستاں گُل چیں نہ ہو

جُزوی ترمیمات

پہلے بند کا چوتھا مصرع یُوں تھا:

خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لیے

پانچواں مصرع یُوں تھا:

درد اُس عالم میں جب کوئی رلاتا تھا مجھے

مرزا غالب

یہ نظم ستمبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے پانچ بند تھے۔ دوسرا بند حذف کر کے اس کی جگہ نیا بند لکھا گیا وہ بند یوں تھا:

معجزِ کلکِ تصوّر ہے و یا دیواں ہے یہ — یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ — نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

پہلا بند ابتدا میں یوں تھا:

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہُوا — ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا
روح تھا تُو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا — زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حُسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

چوتھے بند کے دوسرے مصرع میں "تخیل" کی جگہ "تصور" تھا۔

ابرِ کوہسار

یہ نظم نومبر ۱۹۰۱ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے دس بند تھے۔ بعض بند بالکل حذف کر دیئے ایک کی ٹیپ کا شعر ایک اور بند میں شامل کر لیا۔ بعض مصرعے بدل دیئے۔

حذف شدہ بند

اخترِ قسمتِ گلزار چمک جاتا ہے
غنچۂ گُل مرے سایے سے چٹک جاتا ہے
دلِ بلبل کی طرح گُل سے اٹک جاتا ہے
میرا ہر قطرہ گلستاں پہ پھڑک جاتا ہے
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں[1]

نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا
ہے مجھے دامنِ کہسار میں سننے کا مزا
حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا
وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اترنا اس کا
سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اٹھاتے آنا
اور وہ تھم تھم کے اترتے ہوئے گاتے آنا
شیشۂ خاطرِ محزوں سے غبار اٹھتا ہے
قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اٹھتا ہے

---

[1] اب یہ شعر تیسرے بند کی ٹیپ ہے، پہلے ٹیپ کا شعر یہ تھا:

دل لگی کوہ کے چشموں سے مجھے بھاتی ہے
زندگی اپنی اسی طرح گزر جاتی ہے

کوئی کہتا ہے کہ وہ ابرِ بہار اٹھتا ہے اَور کوئی جوشِ طرب میں یہ پکار اٹھتا ہے

"تند و پُر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
مے کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد"

میری عادت میں ہے اک شور مچاتے آنا سرِ کہسار سے طنبور بجاتے آنا
چھیڑ سے باغ میں کلیوں کو ہنسّاتے آنا شکوہ ہائے ستمِ مہر سناتے آنا
توسنِ باد پہ اُڑتا ہُوا آتا ہوں مَیں
گرمیِ مہر کے کشتوں کا مسیحا ہوں میں

وہ ضیا گسترِ عالم، وہ عروسِ زیبا نام انسان کی بولی میں قمر ہے جس کا
اُٹھ گیا موجِ ہوا سے کبھی دامن جو مرا ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پردا
نظر آتے ہی مگر پردہ نشیں چھُپتے ہیں
روئے تاباں کی جھلک دے کے حسیں چھپتے ہیں

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر چاکِ دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھُل کے گہُر
مقصدِ ہر صدفِ قلزمِ زخّار ہوں مَیں
ابرِ رحمت ہُوں، گہُر دار، گہُر بار ہوں میں

پہلا بند ابتدا میں یوں تھا:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا سرِ کہُسار پہ دیکھے کوئی جوبن میرا

غیرتِ تختۂ گلزار ہے مسکن میرا	کہ گل افشاں ہے سرِ گوشۂ دامن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھکو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھکو

پرندے کی فریاد

(بچّوں کے لیے)

یہ نظم فروری ۱۹۰۷ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور کل بیس شعر تھے۔ نظرثانی میں نو شعر قلم زد ہو گئے اور باقی گیارہ "بانگِ درا" میں شامل ہوئے۔ پوری نظم ابتدا میں یوں تھی:

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہُوا زمانہ	وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی •	وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا
پتّوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے •	ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی	اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم	شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دُھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت	آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اس کی •	تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانا
اِس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں مَیں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں   ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں   میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں • میں دِل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں ان کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں • ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا • اس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے • ساتھی جو ہیں پرانے ان سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے   دِل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے   دُکھّے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گزارے • اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

---

۱ جن شعروں کے سامنے نقطے لگے ہوئے ہیں وہ متروکہ ہیں۔

خفتگانِ خاک سے استفسار

یہ نظم فروری ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے تینوں بندوں میں سے خاصے شعر حذف کر دیئے۔ بعض شعر نئے لکھے بعض میں ضروری ترمیم کی۔ پہلے حذف شدہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

پہلا بند

کھیت سے آتا ہے دہقاں منہ میں کچھ گاتا ہُوا
پا ہے گرد آلود دیتے ہیں مسافت کا پتا

کام دھندا ہو چکا اب نیند ہے آرام ہے
ہائے وہ آغازِ محنت جس کا یہ انجام ہے

رات کی آمد ہے، مرغانِ ہوا خاموش ہیں
ابتدا اور انتہا آپس میں ہم آغوش ہیں

شورشِ گفتارِ انساں کی صدا آتی نہیں
وہ صدا اے نغمۂ گوش آشنا آتی نہیں

دوسرا بند

اے عدم کے رہنے والو تم جو یوں خاموش ہو؟
مے وہ کیسی ہے، نشے میں جس کے تم مدہوش ہو؟

وہ ولایت بھی ہمارے دیس کی صورت ہے کیا؟
شب وہاں کی کیا ہے؟ صبح و شام کی رنگت ہے کیا؟

دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے؟
اُس ولایت میں بھی کیا مجبور کہتے ہیں اسے؟

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا؟
اُس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟

یہ خوشامد اُس ولایت کا بھی کیا دستور ہے؟
واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟

واں کی عزت بھی، حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟
واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟

آہ اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں
واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

خرمنِ دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا؟ اُس جہاں میں ہے تبسّم پر خطر ایسا ہی کیا؟
فکر اینٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے؟ تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟

تیسرا بند

اس جدائی میں نہفتہ وصل کا ساماں ہے کیا؟ چشمِ بستہ سرمۂ گوہر پئے انساں ہے کیا؟
اس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا؟ کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت کا؟
یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق کیا وہاں پر جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق؟
حسن و خوبی ہو کے بے پردہ نظر آتے ہیں کیا؟ اُس جہاں میں عشق کے ارماں نکل جاتے ہیں کیا؟
بے نشاں ہے جس کی ہستی وہ اسی ہستی میں ہے؟ جس کو کہتے ہیں بلندی وہ اِسی پستی میں ہے؟
ہم جسے کہتے ہیں ہستی، ہے وہ کیا تفسیرِ حسن؟ ہے صداقت بھی، سعادت بھی وہاں تصویرِ حسن؟

جُزوی ترمیمات

دوسرے شعر کا نمبر پہلے تیسرا تھا اور تیسرے کا دوسرا۔ تیسرے بند کا چھٹا شعر پہلے یوں تھا:

کیا دلِ انساں کو واں بھی ذوقِ استفہام ہے؟ کیا وہاں بھی جستجو میں رُوح کو آرام ہے؟

شمع و پروانہ

یہ نظم اپریل ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بارہ شعر تھے۔ مندرجہ ذیل شعر حذف کر دیے:

شعر نمبر ۲

وہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بے قرار ہے　　جاں در ہوائے لذّتِ خوابِ مزار ہے

شعر نمبر ۶

بے اختیار سوز سے تیرے بھڑک اُٹھا　　قسمت کا اپنی بن کے ستارا چمک اُٹھا

شعر نمبر ۸

تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ　　اِک نُور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ

شعر نمبر ۹

پروانہ کیا ہے اِک دلِ ایذا طلب ہے یہ　　عینِ وصال و سوزِ جدائی غضب ہے یہ

جُزوی ترمیمات

پہلے شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا:

کرتا ہے اپنی جان کو تجھ پر نثار کیوں

دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں تھا:

کیوں بے قرار کرتی ہے تیری ادا اسے

عقل و دِل

یہ نظم مئی ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں مندرجہ ذیل عنوان سے شائع ہوئی تھی:

خطِ منظوم
(پیغامِ بیعت کے جواب میں)[1]

اس کے چالیس شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں ستائیس حذف کر دیے، صرف تیرہ باقی رکھے اور عنوان بھی بدل دیا۔

حذف شدہ اشعار

خضر سے چھُپ کے مر رہا ہوں میں — تشنہ کام مئے فنا ہوں میں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل — خامشی پر مٹا ہُوا ہوں میں
کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پر — وہ دلِ درد آشنا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ اُلفت کے — آشیانہ بنا رہا ہوں میں
گلِ پژمردۂ چمن ہوں مگر — رونقِ خانۂ صبا ہوں میں
کارواں سے نکل گیا آگے — مثلِ آوازۂ درا ہوں میں
دستِ واعظ سے آج بن کے نماز — کس ادا سے قضا ہُوا ہوں میں

---

[1] یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ پیغام کس طرف سے آیا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ یہ پیغام قادیانی جماعت کی طرف سے ملا تھا۔ اس کی جانب کچھ اشارے خود نظم میں ہیں۔ ایک قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس خط کے جواب میں اسی بحر اور اسی زمین میں ایک نظم سید حامد شاہ نے لکھی تھی، جو قادیانی جماعت کے ممتاز رکن تھے۔ اس کا آخری شعر یہ تھا:

کیوں نہ ہو خاکِ پا مرا اقبال — حامدِ نائب خدا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد دیدۂ حور کی حیا ہوں میں
ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق سننے والے کو دیکھتا ہوں میں
میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں
پردۂ میم میں رہے کوئی اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں
میں کسی کو بُرا کہوں ؟ توبہ ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں
جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن مئے حق سے بھرا ہُوا ہوں میں
ایک دانے پہ ہے نظر تیری اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے اس عبادت کو کیا سراہوں میں
بت پرستی تو ایک مذہب ہے کفرِ غفلت کو جانتا ہوں میں
مرگِ اغیار پہ خوشی ہے تجھے اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تُو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل :

علم پلتا ہے میری گودی میں رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں
تو مری ہمسری کرے ؟ توبہ دیدۂ ہست کی ضیا ہوں میں

دِل :

میرے دم سے جہان بستا ہے　　اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں
گلشنِ طور ہے بہار مری　　قطرۂ بحر آشنا ہوں میں

آخری تین شعر

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں　　تو یہ سمجھے کہ دہر یا ہوں میں!
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب　　سو بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں

فیض اقبالؔ ہے اسی در کا
بندۂ شاہ لافتیٰ ہوں میں

جزوی ترمیمات

تیسرا شعر یوں تھا :-

رہبری دہر میں ہے کام مرا　　رشکِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

دسویں شعر کے پہلے مصرع میں "بیتابی" کی جگہ "بے چینی" تھا۔ بارھواں شعر ابتدا میں یوں تھا :

تو ہے وابستۂ زمان و مکاں　　اور اس قید سے رہا ہوں میں

جس شعر کو اب سب سے آخر میں رکھا ہے، وہ جوابِ دل کے دس شعروں میں سے آٹھواں تھا۔

صدائے درد

یہ نظم جون ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں چھپی تھی۔ گیارہ شعر پہلے بند کے تھے اور انیس دوسرے بند کے۔ نظرِ ثانی میں بہت سے شعر حذف کر دیے۔ دوسرے بند کے ساتویں، نویں اور گیارھویں شعر کو پہلے بند میں شامل کر لیا اور پہلے بند کے آخری چار شعروں کو دوسرا بند بنا دیا۔ حذف شدہ اشعار ذیل میں درج ہیں:

پہلا بند

اے ہمالہ تُو چھپا لے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بے کلی اپنے نشیمن میں مجھے

مدتیں گزری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں؟

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح؟
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح؟

دوسرا بند

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا
آہ اس بستی میں اب میرا گزارا ہو چکا

پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

ہاں سلامِ آخری اے مولدِ گوتم[1] تجھے
اب فضا تیری نظر آتی نہیں محرم مجھے

الوداع اے مدفنِ ہجویریِ[2] اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہِ شنکرِ[3] جادو رقم

---

[1] گوتم بدھ [2] حضرت داتا گنج بخش [3] شنکر اچاریہ مشہور فلاسفر اور مذہبی پیشوا۔

الوداع اے سیرگاہِ شیخ شیراز[۱] الوداع
اے دیارِ بالمیک[۲] نکہت پرواز الوداع

الوداع اے سرزمینِ نانک[۳] شیریں زباں
رخصت اے آرام گاہِ چشتی[۴] عیسیٰ نشاں

رمزِ الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے
کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انساں ہیں یہ
غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں ہیں یہ

جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے

دل حزیں ہے، جاں رہینِ رنجِ بے اندازہ ہے
آہ اک دفتر تھا اپنا، وہ بھی بے شیرازہ ہے

امتیازِ قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں یہ

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
"آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے"

رنگ قومیت، مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی

ایک ہی مے سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے؟

---

۱ شیخ سعدی ۲ مشہور شاعر جس نے رامائن سنسکرت میں نظم کی ۳ گرو بابا نانک ۴ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری۔

شمع

یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں سے بعض شعر حذف کر دیے، بعض میں جزوی ترمیم فرما دی۔

حذف شُدہ اشعار

اِن اشک باریوں میں طہارت کا راز ہے — کیسا وضو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے
ایذا پسند ہے دلِ اندوہ گیں ترا — کیا تجھ پہ رازِ غم کدۂ دہر کُھل گیا؟

اب آغاز کے جن اشعار کو دو بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ابتدا میں یہ ایک بند کے اشعار تھے اور اس بند کی ٹیپ غالب کا یہ شعر تھا:

"از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ"

سمجھے کہ خامشی ہے مآلِ ضیا اے شمع — اے وائے گفتگوئے لبِ بے صدائے شمع
خورشیدِ شب ہے جلوۂ ظلمت رُبا ترا — تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہ ہے چاندنا ترا

جلتی اسی شرار سے ہے شمعِ ماسوا — ساماں طرازِ ظلمتِ شب ہے یہ چاندنا
آزادِ دست بُردِ بقا و فنا ہوں میں — کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

جوں نے کمندِ نالۂ دل میں اسیر ہوں
فرقت میں نیستاں کی سراپا نفیر ہوں

محمود اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے
کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے
دل خار زار کم نگہی میں الجھ نہ جائے
ڈرتا ہوں کوئی میری فغاں کو سمجھ نہ جائے

ایک آرزو

یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے دو بند تھے۔ نظر ثانی میں دوسرا بند کاملاً حذف کر دیا تھا، پہلے بند کے پانچ شعر قلم زد فرما دیے۔

پہلا بند

پتوں کا ہو نظارہ میری کتاب خوانی
دفتر ہو معرفت کا جو گل کھلا ہُوا ہو
یوں وادیوں میں آ کر ٹھہرے شفق کی سُرخی
جیسے کسی گلی میں کوئی شکستہ پا ہو
پچھم کو جا رہا ہو کچھ اس طرح سے سورج
جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو
ظلمت جھلک رہی ہو اس طرح چاندنے میں
جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہُوا ہو
دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جن کی نم سے بُوٹا امید کا ہو

دوسرا بند

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستان والے
موزون ہو گئے ہیں نالے، سخن نہیں ہے
شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن
ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سر زمیں میں رہ کر
میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت
ساقی نہیں وہ باقی، وہ انجمن نہیں ہے

"در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند
چوں نوبتے بہ ما شد آتش بہ جام کردند"۔

سیّد کی لوحِ تُربت

یہ جنوری ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس کے پانچ بند تھے۔ ایک بند پورا حذف کر دیا۔ باقی بندوں میں سے بھی اشعار قلم زد کر دیے۔ وہ ذیل میں درج ہیں:

پہلا بند

اے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تُو
اے کہ مستانہ مئے حسنِ عقیدت کا ہے تُو
بسکہ ہے بادِ صبا یاں کی اخوت آفریں
یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
اپنے گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

دوسرا بند

دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دین کے پردے میں تُو دُنیا کا سودائی نہ ہو
آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنّت نہیں
راہبر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے

تیسرا بند

ہو شرابِ حبِّ قومی میں اگر سرشار تُو
ہو نہ اپنی عزّت افزائی کی تجھ کو آرزو

قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں
رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں

کیا مزہ رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی

دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا

وہ شجر ہے عشقِ اخواں، زندگی ہے جس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دستِ اجل

عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزّت یہی
عشقِ اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کوئی

عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
یہ کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے

خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے ایسی لَے ہے یہ
شیشۂ دل سے اچھل جاتی ہے ایسی مے ہے یہ

چوں زمینائے محبت خوردہ بودم بادہ
تا ثریا رفت ایں قومِ بہ خاک افتادہ

چوتھا بند

اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدِّ نظر
چاہیے سائل کو آدابِ طلب مدِّ نظر

معنیِ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر
چاہیے دنیا کو اس ناداں کی صحبت سے حذر

"آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزار ہا"[1]

---

[1] اب جو اس بند کی ٹیپ کا شعر ہے، وہ نظر ثانی کے وقت لکھا گیا۔

پانچواں بند

چاہیے ہو باعثِ آرامِ جاں شاعر کی لَے	لاج اس جزوِ نبوت[1] کی ترے ہاتھوں میں ہے
دیکھ اے جادو بیاں! تو نے اگر پروا نہ کی	آبرو گر جائے گی اس گوہرِ یک دانہ کی

از شرابِ حُبِّ ہم جنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش[2]

عشق اور موت

یہ نظم نومبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نظرثانی میں اس کے مندرجہ ذیل اشعار حذف کر دیے گئے:

کہیں عجز سے گردنیں جھک رہی تھیں	رعونت کہیں مانعِ بندگی تھی
پتنگا کہیں مستِ ذوقِ تپیدن	کہیں شمع کو نازشِ دلبری تھی
جو قمری کو ملتا تھا طوقِ غلامی	صنوبر کو انعام آزادگی تھی

یہ گرمِ فغاں تھی وہ محوِ تبسم	جو بلبل کا غم تھا وہ گل کی خوشی تھی

---

[1] جزوِ نبوت اشارہ ہے اس مشہور قول کی طرف کہ شاعری نبوت کا ایک جزو ہے۔ خود اقبال نے "شمع اور شاعر" میں کہا: ع که گفتہ ہیں شاعری "جزویست از پیغمبری"۔

[2] نظرثانی میں اس کی جگہ بھی نیا شعر لکھا گیا۔

دوسرے بند سے یہ شعر قلم زد کر دیے گئے:

وہ دردِ محبت وہ ایمانِ ہستی　　وہ افشانِ حسنِ ازل کا ستارا

سرِ کوہ چمکے جو وہ بن کے بجلی　　تو ہو غیرتِ طور ہر سنگ خارا

زہد اور رندی

یہ دسمبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی اور اس میں سے تین شعر حذف کیے گئے۔

دو نذر تو فرماتے تھے ہو کر متبسم　　دیں داروں کی امداد ہے ایماں کی نشانی
کہتے ہیں کہ ہے اس کو محبت فقرائے سے　　دیکھی نہیں ہم نے تو کوئی اس کی نشانی
ہر رات اسے راگ کے جلسوں سے سروکار　　پھرتا ہے سرِ مزرعِ اوراد یہ پانی

رخصت اے بزمِ جہاں

یہ نظم مارچ ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے تینوں بندوں میں سے مندرجہ ذیل اشعار حذف کر دیے گئے:

پہلا بند

تیر لگتی ہے نگاہِ چشمِ نو دولت مجھے　　ہے ترے عجز خوشامد زادہ سے نفرت مجھے
مدتوں ضبطِ تکلم کے ستم سہتا رہا　　اشک کی صورت میں اپنا حالِ دل کہتا رہا

خامشی کا بار لیکن اب اُٹھا سکتا نہیں　　آئنہ مشرب ہوں، راز اپنا چھپا سکتا نہیں

دوسرا بند

مل کے رہتی ہیں تہِ دامانِ دریا مچھلیاں　　یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں

مل کے اڑتے، مل کے گاتے ہیں گلستاں کے طیور　　خیمہ زن انساں ہیں شہروں میں ویرانوں سے دور

تیسرا بند

کوہ کے دامن میں کیا بے مدعا پھرتا ہوں میں　　کیا مصافِ زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں میں

طفلِ شیر خوار

مطبوعہ "مخزن" بابت فروری ۱۹۰۴ء۔ اس میں سے ذیل کے شعر حذف کیے:

ایسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامانِ خوشی　　کیا کسی دکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی؟

درد سے اے نو اسیرِ حلقۂ گردابِ درد　　ہوتی جائے گی تجھے آگاہیِ اسبابِ درد

اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بیتابی ہے کیا؟　　اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا؟

ہے تجھے کچھ فرش پر اس کے گرانے کا مزا　　ٹوٹ جائے آئنہ میرا، تجھے پروا ہے کیا

تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی　　مل گئی جو شے تجھے تیرا کھلونا بن گئی

جو تری آنکھوں کے آگے ہو ہوس انگیز ہے　　یعنی ہر شے توسنِ ادراک کو مہمیز ہے

پھوٹتی ہے فصلِ گل کی جس طرح پہلے کلی — منہ پہ ڈالے سبز پتی کی نقابِ نازنی
یوں ترے ہنسنے سے دل میں ہے تمنا کی نمود — اے گلِ نشگفتۂ صحنِ چمن زارِ وجود

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو — وصلِ ہستی سے چمک اٹھا شرارِ آرزو

تصویرِ درد

یہ نظم "انجمن حمایتِ اسلام" کے انیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی اور اس کے دس بند تھے۔ "مخزن" نے اسے مارچ ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں زائد صفحے لگا کر چھاپ دیا تھا۔ نظرِ ثانی میں اس کے دو بند کاملاً حذف کر دیے گئے اور مختلف بندوں کے بہت سے اشعار کٹ گئے:

پہلا بند

ہوئی ہے مری آواز کو لذت خموشی کی — نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری
مری حیرت روانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی! — کہ مینا بن گئی آخر شرابِ ارغواں میری
شکارِ خوفِ رسوائی ہے میری نو گرفتاری — کسی صورت ہو یا رب ساری دنیا رازداں میری

دوسرا بند

شکایت آسماں کی میرے لب پر آ نہیں سکتی — میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
مری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو — وہ عاصی ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں
مرے طوفِ جبیں کو اڑ کے خاکِ آستاں آئی — میں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں

سیہ کاری مری زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں
سبھی کچھ ہوں مگر ہم رنگِ محرابِ عبادت ہوں

مری ہستی نہیں، وحدت میں کثرت کا تماشا ہے
کہ خود عاشق ہوں، خود معشوق ہوں، خود دردِ فرقت ہوں

وضو کے واسطے کعبہ لیے آتا ہے زمزم کو
الٰہی کون سی وادی میں میں محوِ عبادت ہوں

نہ چھپ او کاٹنے والے مجھے میرے نیستاں سے
سراپا صورتِ نے تیری فرقت کی شکایت ہوں

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ ہے مرا کعبہ
میں بندہ اور کا ہوں، امتِ شاہِ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں آنے والے کو
مجھے معذور رکھ، میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو [لہ]
اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں رازِ ہستی کو

تیسرا بند

شرابِ عشق میں کیا جانے کیا تاثیر ہوتی ہے
کہ مشتِ خاک جس سے رشکِ اکسیر ہوتی ہے

یہ وہ مے ہے تکلم بن کے رہتی ہے زبانوں میں
نگاہوں میں مثالِ سرمۂ تسخیر ہوتی ہے

زباں میری ہے لیکن کہنے والا اور ہے کوئی
مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے

بس اے ذوقِ خموشی! رخصتِ فریاد دے مجھ کو
کہ چپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے

اثر ایسا کیا ہے دل پہ تاراجِ گلستاں نے
مجھے پروانۂ رنگِ گل صدائے تیر ہوتی ہے

سنا ہے میں نے جو کچھ، اہلِ محفل کو سناتا ہوں
خموشی بے محل مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے

نفس کا آئنہ باندھا ہوا ہے میں نے آہوں میں
مری ہر بات میرے درد کی تصویر ہوتی ہے

لہ اس شعر کی جگہ تیسرے بند کے آخری شعر کو ٹیپ بنا دیا گیا اور وہ پورا بند حذف کر دیا۔

خود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہوں
صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے

تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبت میں
مثالِ خامشی گویا مری تقریر ہوتی ہے

سُنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

چوتھا بند

ہوائے امتیازِ ملت و آئیں کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے
مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں

تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے
کہ ہے چپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں

مزہ دیتا نہیں کچھ صورتِ گل صد زباں ہونا
زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اجاڑے گی گلستاں کو
خدا رکھے یہ ہے اپنے پرانے مہربانوں میں

قیامت ہے کہ ہر ذرے سے پیدا سو مصیبت ہے
زمیں بھی شاید اپنی جا ملی ہے آسمانوں میں

اُڑا لے جائے گی موجِ ہوائے نیستی ان کو
نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رُلایا خوں مری آنکھوں کو تیرے خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے [1]

پانچواں بند

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

---

[1] اس ٹیپ کی جگہ نظرِ ثانی میں نیا شعر لکھا گیا یعنی:

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گام زن محبوبِ فطرت ہے

نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاکِ زنداں کا ۔۔۔ کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا
شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی ۔۔۔ مگر تعبیرِ خوابِ اہلِ زنداں کر کے چھوڑوں گا
ابھی مجھ دل جلے کو ہم صفیرو! اور رونے دو ۔۔۔ کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا
تعصب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے ۔۔۔ وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی ۔۔۔ مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا
اٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوبِ یک رنگی ۔۔۔ تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اس نے میرے پہلو کو
تری افتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو [1]

چھٹا بند

اڑا کر لے گئی لذت تجھے آوارہ رہنے کی ۔۔۔ چمن میں کچھ نہ دیکھا صورتِ بادِ صبا تو نے
تری تعمیر میں مضمر ہوئی افتادگی کیونکر ۔۔۔ لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تو نے
تلاشِ ہمّتِ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا ۔۔۔ جو پہنی صورتِ تصویر کاغذ کی قبا تو نے
خبر لیتا رہا افتادگی کا خاکِ ساحل سے ۔۔۔ نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خوابِ پا تو نے
نہیں ہے دہریت کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا ۔۔۔ قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تو نے
وہ حسنِ آدم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا ۔۔۔ غضب ہے آسمانوں میں دیا اس کا پتا تو نے

---

[1] اس کی جگہ نیا شعر لکھا گیا یعنی:

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے ۔۔۔ زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے
صدائے غیر سمجھا جب سنی اپنی صدا تو نے

ساتواں بند

نظر اس دور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا
کہ صہبائے محبت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن پہنچ عرشِ معلّیٰ پر
نگاہوں کو نظر اس بام کا زینا نہیں آتا

عدوِ صبحِ صفائے دل کی ہے ظلمت تعصب کی
مقابل چشمِ نابینا کے آئینا نہیں آتا

یہیں بے نور ہے محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا؟
کہ تجھ کو دیکھنا اے دیدۂ بینا! نہیں آتا

یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دل چور ہو جاتا
صفا رہنا تجھے مانندِ آئینا نہیں آتا

اکارت ہے بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں
کہ ہاتھ اس طرح وہ پوشیدہ گنجینا نہیں آتا

بنا آنکھوں کو جامِ اشک، دل کو درد کا مینا
مزہ جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا

بجھا دینا ہی اچھا ہے چراغِ زندگانی کا
محبت میں جو مر کے تجھے جینا نہیں آتا

بنا اس راہ میں ذوقِ طلب کو ہم سفر اپنا
اکیلے لطفِ سیرِ وادیِ سینا نہیں آتا

تلاشِ خضر کب تک، تشنۂ زہرِ محبت ہو
جسے مرنا نہیں آتا، اسے جینا نہیں آتا

نمی گویم قیامت جوش زن یا شورِ طوفاں شو
ز طوفاں دست بردار آنچہ نتوانی شدن آں شو

آٹھواں بند

تبسم سے غرض ہے پردہ داری چشمِ گریاں کی
چھپا کر بیٹھ صبحِ عید میں شامِ محرم کو

جمالِ یوسفِ یثرب کو دیکھ آئینۂ دل میں
نہ ڈھونڈ اے دیدۂ حیراں نمودِ ابنِ مریم کو

شفا دیکھی ہے بیماری میں کیا ان درد مندوں نے
کہ بے حاصل سمجھتے ہیں تلاشِ ابنِ مریم کو
خدا جانے یہ بندے کون سی آتش میں جلتے ہیں
کہ خاکستر کی اک مٹھی سمجھتے ہیں جہنم کو

نویں اور دسویں بند میں سے نہ کوئی شعر بدلا گیا، نہ حذف کیا گیا۔

نالۂ فراق

یہ آٹھ بند کی نظم تھی مئی ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نظر ثانی میں جو بند قلم زد ہوئے وہ ذیل میں درج ہیں:

ہو گئی رخصت مسرت، غم مرا ہمدم ہوا
دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا
دل مرا منت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا
حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا بازست لیکن رادِ گوشم دیدہ اند

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پرخوں مرا
صورتِ سیماب مضطر ہے دلِ محزوں مرا
دردِ فرقت سے ہے رنگیں نالۂ موزوں مرا
داغِ حرماں ہے سراپا ہر گُلِ مضموں مرا
آہ! وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

زندگی کا دامنِ انساں میں گویا خار ہے
آرزو کا دل میں، سینے میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرّے سے اگتا خار ہے
خارِ فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے

"زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است
تا نفس باقی است در پیراہن ما سوزن است"

چانْد

جولائی ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو بند تھے، نظرِ ثانی میں مندرجہ ذیل شعر حذف کر دیے:

اے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی
رات کے دامن میں گویا ہے سحر سوئی ہوئی

حسنِ کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے
چاندنی میں تیری اک تسکینِ غم آمیز ہے

گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دُور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دُور
ہاں، اُتر آ دل میں میرے ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

بلال رضؓ

یہ نظم ستمبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ مندرجۂ ذیل اشعار قلم رد کر دیے گئے:

ستم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موج ہوا
"خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

نوٹ: مختلف اشعار کے درمیان خط کھینچنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مختلف مقامات سے حذف ہوے تھے۔

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر — علیؑ کے سینے میں جو راز تھا کھلا تجھ پر

نمازِ عشقِ حسینِ حجاز ہے گویا — یہی نماز خدا کی نماز ہے گویا

سرگزشتِ آدم[۴]

یہ نظم ستمبر ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں سے مندرجۂ ذیل اشعار حذف کر دیے گئے:

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے — ہر ایک چیز میں دیکھا اسے مکیں میں نے

سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیم ایسی — ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں — کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے

اٹھائے تلخیِ انکار کے مزے کیا کیا — بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے

آخر میں مندرجۂ ذیل پانچ شعر اور تھے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا — خدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں میں نے
وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی — سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے
نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم — بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے
خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا — یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں نہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبالؔ
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

جگنو

مطبوعہ "مخزن" دسمبر ۱۹۰۴ء۔ اس کے دوسرے بند سے مندرجۂ ذیل شعر حذف کیا گیا:

اِک مشتِ گِل میں رکھا احساس کا شرارہ — انساں کو آگہی کیا ظلمت کو چاندنی دی

صبح کا ستارہ

مطبوعہ "مخزن" دسمبر ۱۹۰۴ء۔ دو شعر حذف کر دیے تھے۔

پہلے بند کا دوسرا شعر:

عارضی حُسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر — یہ ملا خسروِ خاور کا پیامی بن کر

دوسرے بند کا آٹھواں شعر:

صبر کا خون نکل آیا ہو مل کر مجھ میں   ایک طوفان ہو افکار کا مضمر مجھ میں

ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

آخری بند جو نظرِ ثانی میں ترک کر دیا تھا:

گوتم کا جو وطن ہے، جاپان کا حرم ہے   عیسٰی کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے   ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے، ارم ہے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

جُزوی ترمیمات

تیسرے بند کے پہلے شعر کے مصرعے آگے پیچھے کر دیے۔ اس بند کے تیسرے مصرع میں "نے" کی جگہ "ہے" بنا دیا۔

نیا شوالہ

مطبوعہ "مخزن" مارچ ۱۹۰۵ء۔ دو بند تھے۔ پہلے میں سے ایک شعر اور دوسرے میں سے متعدد اشعار قلم زد کر دیے۔

پہلا بند

کچھ فکر پھوٹ کی کر، مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بِس بھری ہوا نے

دوسرا بند

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اِس ہردوارِ دل میں لاکر اسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت، چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں، درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا، لے لے کے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سُنا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو، ناقوس میں ملا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن، کہتے ہیں پیت اس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا، ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا[1]

---

[1] بانگِ درا کا آخری شعر اصل نظم میں موجود نہ تھا، یہ نظرِ ثانی کے وقت لکھا گیا۔

داغ

یہ "مخزن" کے "یادگارِ داغ" نمبر بابت اپریل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ردّوبدل کی کیفیت درج ذیل ہے :

۱۔ پہلے نظم کے چار بند تھے۔ نظرِ ثانی کے وقت آخری بند کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے پانچ بند بنا دیے گئے۔

۲۔ دوسرے بند سے مندرجۂ ذیل شعر پہلے بند میں شامل کر لیا گیا :

بلبلِ دہلی نے باندھا اس چمن سے آشیاں
ہم نوا ہیں سب عنادل، باغِ ہستی کے جہاں

اور چند شعر حذف کر دیے۔ جو یہاں درج کیے جاتے ہیں :

۳۔ چوتھے بند کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا :

آہ! اے بیت الحرامِ مذہبِ اہلِ سخن

حذف شدہ اشعار

جوہرِ رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال ۔۔۔ پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال [۱]
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر ۔۔۔ داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر

---

[۱] بظاہر ان سے مراد میرزا غالب اور میر تقی ہیں، اس لیے کہ بعد کے شعر میں میرزا کی فکر اور میر کے درد کا ذکر ہے۔ فکر کے لحاظ سے غالب ہی تصور میں آ سکتا تھا نہ کہ سودا۔

شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہُوا　　دیدۂ خونبار پھر منّت کش درماں ہُوا

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ! دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

کنارِ راوی

مطبوعہ نومبر ۱۹۰۵ء - اس میں سے دو شعر حذف کیے اور دونوں دوسرے بند کے تھے۔

نظارہ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا؟　　یہ کہنہ مشق نوآموزِ پیچ وتاب ہے کیا؟

درختوں کے متعلق کہتے ہیں:

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پا بہ گل ہیں کھڑے

اِلتجائے مُسافر

(بہ درگاہِ حضرتِ محبوبِ الٰہی دہلی)

یہ نظم اکتوبر ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بہت سے شعر حذف کر دیے گئے۔

ابتدا میں پہلے بند کے آٹھ شعر تھے۔ مندرجۂ ذیل تین شعر حذف ہوئے:

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق　　دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

خروشِ میکدۂ شوق تیرے دم سے ہے   طلب ہو خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا

کرم کرم کہ غریب اللّٰہ یار ہے اقبالؔ   مریدِ پیرِ نجف ہے غلام ہے تیرا

دوسرے بند کے شروع میں یہ شعر تھے:

کیا ہے تیرا مقدّر نے مدح خواں مجھ کو   کہے ھزار مبارک مری زباں مجھ کو
چڑھا گئے پھول مرے رنگِ رفتہ کے سرِ قبر   اڑائے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھ کو
بیاں کروں تپشِ عشق کو تو آتشِ دل   شرارے دے پئے تمہیدِ داستاں مجھ کو
میں تفتہ دل ہوں پرانا نیاز مند ترا   دکھایا آج خدا نے یہ آستاں مجھ کو
مرے سفینے کو تُو نے کنارہ بوس کیا   اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھ کو

تلاشِ مہر میں شبنم صفت اڑا کے چمن   ذرا سا دیتا ہے غنچے کا آشیاں مجھ کو

رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک   نہیں ہے آرزوے عمرِ جاوداں مجھ کو

گریز میکر دلِ دردمند کا ہے شعار   بہت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مجھ کو

وہ میرا یار بھی، معشوق بھی، برادر بھی
کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھ کو

یونہی بنی رہے محفل مرے احبّا کی
ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

قسم ہے اس کے دلِ دردمند کی آقا
تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو

سوامی رام تیرتھ

ابتدا میں اس کے کل سات شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں ساتواں شعر قلم زد کر دیا:

کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

عبدالقادر کے نام

نظرِ ثانی میں مندرجہ ذیل شعر حذف کر دیے گئے:

پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے
حدتِ دم سے اسی شعلے کو پیدا کر دیں

تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سپند
قطعِ منزل کے لیے آبلۂ پا کر دیں

درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں
جنس کمیاب ہے آ نرخ کو بالا کر دیں

زاہدِ شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال
خشک ہے اس کو غریقِ نمِ صہبا کر دیں

سنگ رس شاخ چنی ہم نے نشیمن کے لیے
اپنے بے درد دل کو آمادۂ ایذا کر دیں

صقلیہ

(جزیرۂ سسلی)

یہ نظم اگست ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی نظر ثانی میں مندرجہ ذیل ترمیمات کی گئیں:

پہلے بند کا شعر نمبر ۲ پہلے یوں تھا:-

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی　　بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

شعر نمبر ۳، ۴، ۵- ابتدا میں یوں تھے:

آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل　　جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل

زندگی دنیا کو جن کی شورش قُم سے ملی　　مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی

جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے

وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

تیسرے بند کا آخری شعر ابتدا میں یوں تھا:

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا　　یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

بلادِ اسلامیہ

یہ نظم اپریل ۱۹۰۹ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں بعض اشعار حذف ہو گئے اور دو میں جزوی ترمیم ہوئی۔

حذف شدہ اشعار

پہلا بند۔ تیسرا شعر:

دورِ گردوں میں ہنوز سیکڑوں تہذیب کے
پل کے نکلے مادرِ ایّام کے آغوش سے

پانچواں بند۔ شعر نمبر ۴، ۵، ۶

خشک لبِ انساں کو جس نے آبِ جاں پرور دیا
عقل کو آزادِ زنجیرِ توہم کر دیا

جس نے عہدِ وصل باندھا مدتِ دوراں کے ساتھ
جس نے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کے ساتھ

جس کے ڈر سے وہم کا قصرِ کہن آئیں گرا
گردنِ انساں سے طوقِ راہبِ خود بیں گرا

چھٹا بند پورا حذف کر دیا گیا۔

گو مٹانا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار
عظمتِ ملت کی باقی یادگاریں ہیں ہزار

یہ ہویدا ہے کہیں مٹتے ہوئے آثار میں
یا نمایاں ہے کسی گرتی ہوئی دیوار میں

اُجڑے گورستاں کی خاموشی سے ہم آغوش ہے
شانِ پیشیں اشکِ خونِ قوم سے گل پوش ہے

نالہ کرتی ہے کہیں خاموش سوتی ہے کہیں
اہلِ ملت کی فراموشی کو روتی ہے کہیں

جلوہ گاہیں اس کی ہیں اپنی زیارت کے لیے
اشکباری کے لیے، غم کی حکایت کے لیے

جزوی ترمیمات

دوسرے بند کے شعر نمبر ۲ کا دوسرا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

لالہ صحرائے یثرب یعنی تہذیب حجاز

چوتھے بند کے آخری شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

کشورِ اسلام کا اے مسلمو دل ہے یہ شہر

گورستانِ شاہی

نظر ثانی میں بعض شعر حذف کر دیے گئے اور بعض میں جزوی ترمیم کر دی۔

چوتھے بند کا چوتھا شعر حذف کر دیا گیا:

کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں　　چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں

گیارھویں بند کے حذف شدہ اشعار:

شعر نمبر ۱، ۲۔

صبح کے تارے پہ تھی مشرق کے رہزن کی نظر　　وہ اڑا کر لے گیا آویزۂ گوشِ سحر
شب کے اختر دیدۂ خورشید سے ڈرتے ہیں یہ　　بھیس شبنم کا بدل کر سیرِ گل کرتے ہیں یہ

شعر نمبر ۵، ۶۔

راتِ یہ تاروں بھری ذوقِ نظر کی عید ہے
ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے

اُگتے ہیں شاخِ چمن سے شعلۂ بے سوز گل
رُوح کا فردوس ہے حسن نظر افروز گل

بارھویں بند کا چھٹا شعر:

خندۂ طفلک سے ہے اس کی چمک محبوب تر
چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پُرخطر

جُزوی ترمیمات

پہلے بند کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع ابتدا میں یُوں تھا:

یعنی دھندلا سا جبین ماہ کا آئینہ ہے

اسی بند کے آخری شعر کا پہلا مصرع یوں تھا:

فطرتِ نظّارۂ امکاں سراپا درد ہے

تیسرے بند کے آخری شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

گرچہ باغِ زندگی سے گل بداماں ہے زمیں

آٹھویں بند کا تیسرا شعر ابتدا میں یوں تھا:

یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے
پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

گیارھویں بند کا آٹھواں شعر پہلے یوں تھا:

زندگی کی مے سے مینائے جہاں لبریز ہے
منظرِ حسرت بھی ہے کوئی تو حُسن آمیز ہے

فلسفۂ غم

یہ نظم جولائی ۱۹۱۰ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نظرثانی میں تیسرے بند کے چوتھے شعر میں ترمیم کی گئی۔ یہ شعر شروع میں یوں تھا:

گو بظاہر تلخیِ دوراں سے آرمیدہ ہے ‏ ‏ زندگی کا راز اس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے

نصیحت

پہلے شعر کا پہلا مصرع شروع میں یوں تھا:

کل ملا مجھ سے جو اقبالؔ تو پوچھا میں نے

چوتھا شعر حذف کر دیا گیا جو یہ تھا:

کبھی ایراں کے لیے ہو جو دعا کا جلسہ ‏ ‏ عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

آخر کے تین شعر بھی حذف ہو گئے جو یہ تھے:

سن کے کہنے لگا اقبال عجب فرمایا ‏ ‏ شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصافِ ضروری تو ہیں موجود مگر ‏ ‏ ہے کمی ایک کہوں تجھ سے جو ہو فاش نہ راز
ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی ‏ ‏ اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

شکوہ

"شکوہ" میں صرف ایک مصرع ایسا نظر آیا جس میں ڈاکٹر صاحب نے ترمیم فرمائی اور وہ ذیل میں درج ہے:

پہلی صورت:

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے ‏ ‏ برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگرسوزی دے

ترمیم شدہ صورت :

برق دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے

غرّہ شوّال
(یا)
ہلالِ عید

پانچویں شعر کا پہلا مصرع شروع میں یوں تھا :

زندگی تیری جبیں بوسی اسی رایت کی ہے

پہلے بند میں سے مندرجۂ ذیل شعر حذف کر دیا گیا :

وسعتِ ہستی میں گو رفعت تجھے منظور ہے
اے فلک مسکن! افق گردی ترا دستور ہے

دوسرے بند میں سے بھی دو شعر حذف ہو گئے، جو یہ تھے :

اس چمن میں اپنی قسمت کی نگوں ساری بھی دیکھ
رہ گئے اپنی کہن دامی سے ہم محرمِ صید
اُمّتِ عیسیٰ کا آئینِ جہاں داری بھی دیکھ
مکر کے پھندے میں شہبازِ مراکش آ گیا

شمع اور شاعر

نظرِ ثانی میں ساتویں بند کا پہلا شعر حذف ہو گیا، جو یہ تھا :

ملک ہاتھوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھل گئیں
سُرمۂ چشمِ دشت میں گردِ رمِ آہو ہُوا

حضورِ رسالت مآب میں

یہ نظم اکتوبر ۱۹۱۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نظرِ ثانی میں تیسرا شعر حذف کر دیا گیا، جو یہ تھا:

ہوا رفیقِ اجل اشتیاقِ آزادی
سمندِ عمر کو اک اور تازیانہ ہُوا

جوابِ شکوہ

جب مئے درد سے ہو خلقت شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش

کشورِ دل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش
چرخ سے سوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش

قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہُوا عرش پہ نازل میرا

جس طرح احمدِ مختار ہے نبیوں میں امام
اس کی امت بھی ہے دنیا میں امامِ اقوام

کیا تمھارا بھی نبی ہے وہی آقائے انام
تم مسلماں ہو؟ تمھارا بھی وہی ہے اسلام

اس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اس خم میں نہیں

وسعتِ کون و مکاں ساز ہے مضراب ہے یہ
دہر مسجد ہے سراپا، خمِ محراب ہے یہ

جامِ گردوں میں عیاں شکلِ مئے ناب ہے یہ | روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے یہ
صوت ہے نغمۂ کُن میں تو اسی نام سے ہے
زندگی زندہ اسی نور کے اتمام سے ہے

انجم اس کے فلک اس کے ہیں، زمیں اس کی ہے | کیا یہ غبار کی دنیا ہے؟ نہیں اس کی ہے
سجدے مسجود ہوں جس کے وہ جبیں اس کی ہے | وہ ہمارا ہے امیں، قوم امیں اس کی ہے
طوف احمد کے امینوں کا فلک کرتے ہیں
یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا ملک کرتے ہیں

فاطمہ بنت عبداللہ

بوقت نظرثانی اس نظم کے چار شعر حذف کر دیے گئے اور دو شعروں میں جزوی ترمیم کی گئی۔

کس قدر عزت تجھے اے حورِ صحرائی ملی | غازیانِ ملتِ بیضا کی سقائی ملی

بانگِ درا میں یہ شعر یوں چھاپا گیا ہے:

یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی | غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

حذف شدہ شعر یہ ہیں:

ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر | دل کہ برگِ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر
سینۂ ملت میں ایسا جلوۂ نادیدہ تھا | جس کے نظارے میں اک عالم سراپا دیدہ تھا
یعنی نور ز ہیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہور | دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

بانگِ درا میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا ہے:

"تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور"

ہے ابھی جن کے لیے رفتار کی لذت نئی
آسماں کا خم نیا، وسعت نئی، عظمت نئی

صدیقؓ

آخری شعر کا پہلا مصرع شروع میں یوں تھا:

"پروانے کو چراغ، عنادل کو پھول بس"

والدہ مرحومہ کی یاد میں

اس نظم کے مندرجہ ذیل شعر نظرِ ثانی میں حذف کر دیے تھے:

اپنی نادانی میں انساں کس قدر آسودہ ہے
تہمتِ تاثیر سے موجِ نفس آلودہ ہے

زندگی کی رہ میں جب میں طفلِ نو رفتار تھا
جادۂ خوابیدہ ہر ہر گام پر دشوار تھا

قطع تیری ہمت افزائی سے یہ منزل ہوئی
میری کشتی بوسہ گستاخِ لبِ ساحل ہوئی

وہ[1] قوی فطرت کہ ہے جس کی طبیعت استوار
جس کے دل سے کانپتے ہیں حادثاتِ روزگار

---

[1] اپنے بھائی کی طرف اشارہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں ثباتِ زندگی پیکر سے ہے
پیکروں کی بے ثباتی جوہرِ پیکر سے ہے

خامِ فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی
صبحِ شبنم سے بیاضِ چشمِ تر سمجھی گئی

دیکھنے میں گرچہ ہے مثلِ شرر ان کا فروغ
خندہ زن ہے صرصرِ ایامِ پرّاں کا فروغ

کیسی حجت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی
دن کے ہنگاموں کا ہے مدفن خموشی رات کی

ظلمتِ آشفتہ کاکل وسعتِ عالم میں ہے
اشکِ انجم در گریباں روز کے ماتم میں ہے

طفلکِ شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے
رات کے آغوش میں لپٹا ہوا بے ہوش ہے

آبِ دریا خفتہ ہے موجِ ہوا غش کردہ ہے
پستِ ہر ہستی کے سازِ زندگی کا پردہ ہے

شعاعِ آفتاب

یہ نظم "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ یہ پہلے پہل اس مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جو سر ایکل اوڈوائر گورنر پنجاب کے حکم سے ۱۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگِ یورپ میں اتحادیوں کی فتحمندی پر منعقد ہوا۔ یہ یکم فروری ۱۹۱۹ء کے "حق" اخبار میں پہلے صفحے پر چھپی تھی۔ نظرِ ثانی میں اس کے ساتویں شعر کا ایک مصرع جزواً بدل دیا گیا۔

ابتدا میں مصرع یوں تھا:

"میں کوئی بجلی نہیں فطرت میں گو نادری ہوں میں"

اس کا آخری شعر یوں تھا:

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اُٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

اسے حذف کرکے نیا شعر لکھ دیا گیا۔

غزلیات

○

بلا کشانِ محبت کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں
فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں — جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں
نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ — وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ — کہا جو سر کو جھکا کر گنہگار ہوں میں

رہی نہ زہر میں اقبال وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

○

کیا مزا بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا — ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا
کس بتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا — حسرتِ دل پر ہے برقع دامنِ فریاد کا
جب دعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب — غیر رو کر لے گئے حصہ تیری فریاد کا
ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا — دور سے چہرہ نظر آیا اگر صیاد کا
سن کے اس کو بے رخی سے بھاگ جاتا ہے الم — کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا
شرم آئی جب مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ — آب میں ہے غرق گویا نیشتر فصاد کا
قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش قد کو کیا — ہے چھری ان کے لیے پتہ ہر اک شمشاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبالؔ تیری یاد کا[1]

○

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں — پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سلایا ان کو — بخت خفتہ کو مرے پاؤں دعا دیتے ہیں
بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے — قسمیں سو لیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں
رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عُریانی پر — دھجیاں دامنِ صحرا کی اُڑا دیتے ہیں
موت بازار میں بکتی ہے تو لا دو مجھ کو — ہم نشیں کس لیے جینے کی دعا دیتے ہیں
ایسی ذِلّت ہے مرے واسطے عزّت سے سوا — خود وہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں
غیر کہتے ہیں کہ یہ پھول گیا ہے مُردہ — قبر پر میری جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں
موت بولی جو ہُوا کوچۂ قاتل میں گزر — سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں
ان کو بے تاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا — ہم دعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبالؔ
حضرتِ داغؔ کے اشعار سُنا دیتے ہیں[2]

۱؎ "زبان" دہلی بابت نومبر ۱۸۹۳ء ۲؎ "زبان" دہلی فروری ۱۸۹۴ء

تصور بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا
بلندی پر ستارا ہے شبِ تاریک ہجراں کا

نقاہت قیس کی بولی جو گزری پاس سے لیلیٰ
ذرا دامن بچانا یہ بھی کانٹا ہے بیاباں کا

جو ڈالی خاک مٹھی سے کہا نالوں نے چلّا کر
تجھے آتا نہیں سر پر اٹھا لینا بیاباں کا

اُڑا جب طائرِ رنگِ حنا لیلیٰ کے ہاتھوں سے
وہیں پھندا بنایا قیس نے تارِ گریباں کا

جنوں کو زخمِ دل کہتا ہے قائل میں بھی ہوں تیرا
جو چاہا بن کے آ نکلے کوئی پرزہ گریباں کا

جو وحشت میں کبھی ہوے میانِ یار کو دیکھا
جنوں کہنے لگا یہ تار ہے تیرے گریباں کا

یہی کہتا ہے چاکِ دامنِ یوسف زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تارِ نگاہِ پیرِ کنعاں کا

سمجھ کر اخترِ قسمت اٹھا لیتے ہیں ہم اس کو
ستارا جب گرا کوئی ترے ماتھے کی افشاں کا

جنوں! تیرِ نگاہِ یار نے چھلنی کیا سینہ
نہیں مشکل رہا اب چھاننا خاکِ بیاباں کا

کبھی تیرِ جنوں دل میں ترازو ہو ہی جائے گا
کبھی کام آ ہی جائے گا مرے کانٹا بیاباں کا

حیا مانع رہی لیکن ادھر جذبِ محبت تھا
کسی نے اُٹھ کے آخر روزنِ دیوار سے جھانکا

دمِ زورِ جنوں آخر اسی سے سر پٹکتا ہوں
مرے سر پر بڑا احسان ہے دیوارِ زنداں کا

رقیبوں کو جلاتی ہے تمھیں بیتاب کرتی ہے
تمھیں کہہ دو اثر کیا کم ہے میری آہِ سوزاں کا؟

غضب ہو گا کہیں اب وصل کا وعدہ نہ کر دینا
کہ خوگر ہو گیا ہوں میں شبِ تاریکِ ہجراں کا

بُرا ہو بدگمانی کا اسی پر آنکھ رہتی ہے
نگہباں جانتے ہیں وہ مجھے اپنے نگہباں کا

بدل جائے اگر میرا مقدر اس کی قسمت سے
قدم آنے نہ دوں تیری گلی میں ایسے درباں کا

سمٹ کر تنگیِ دل سے سویدا بن گیا آخر
خیال آیا اگر دل میں تری زلفِ پریشاں کا

مزا انکار میں ہے وصل کے اقرار سے بڑھ کر
کرشمہ ہے یہ سب شیرینیِ تقریرِ جاناں کا

ہماری شورِ بختی کا اثر اتنا تو ہو یا رب
نہ ہو زخمِ جگر محتاج قاتل کے نمکداں کا

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا[1]

○

۱۸۹۶ء کے مشاعرے کی غزل :

تم آزماؤ "ہاں" کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے

کم بخت اک "نہیں" کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے

ہم موت مانگتے ہیں، وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے انھوں نے اَور ہی معنیٔ "وصال" کے

اے ضبط، ہوشیار! مرا حرفِ مدعا
قابو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے

ان کی گلی میں اَور کچھ اندھیر ہو نہ جائے
اے ضعف! دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

---

[1] شورِ محشر (مشاعرۂ لاہور کا ماہوار رسالہ دسمبر ۱۸۹۶ء)

میں نے کہا کہ بے دہنی اور گالیاں؟ — کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے، جائیے، ہم سے نہ بولیے — قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے
بگڑے حیا نہ شوخیِ رفتار سے کہیں — چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب — عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے
کہتا ہے خضر دشتِ جنوں میں مجھے کہ چل — آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

○

یہ غزل ایک دعوت میں حسبِ فرمائش شیخ عبدالقادر مرحوم فی البدیہہ کہی گئی۔ طرح بھی شیخ صاحب نے تجویز کی تھی:

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں ہوگا — پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا
مردِ مومن[1] کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے — موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

---

[1] یہ غزل انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کی ہے لیکن غور فرمائیے کہ زندگی کے آخری دور میں بھی اقبالؔ نے اسی مضمون کو حقائقِ حیات کے نچوڑ کی شکل میں پیش کیا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

چوتھے شعر میں "خودی" بھی موجود ہے اور چھٹے شعر میں خودداری کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں۔

عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
کبھی گریاں، کبھی خنداں، کبھی عُریاں ہوگا

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنّتی ہوگا فرشتوں میں نمایاں ہوگا

کیا کہیں مست مئے عشق کہاں ہوتا ہے
بہ درِ دیرِ مغاں ناصیہ کوباں ہوگا

جیتے جی سر جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا

زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی خاطر
بوالہوس ہوگا جو شرمندۂ احساں ہوگا

چار سُو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبال غزل خواں ہوگا

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دور سے دیکھا مجھے

اے حبابِ بحر، اے پروردۂ دامانِ موج
کچھ پتہ ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کیا کروں اے دل چمن آرائے عالم کا گلہ
ضبط کی طاقت نہ دی، بخشا لبِ گویا مجھے

دل میں جو آتا ہے کہ دوں گا کہ میں محبوب ہوں
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے کچھ نہیں پروا مجھے

کھل گئی چشمِ تماشا اپنی جس دم اے کلیم
طُور ہر ذرّے کے دامن میں نظر آیا مجھے

قہر کر دینا نہ اے صیّاد مجھ کو چھوڑ کر
ہو گیا ہے قید سے کچھ پیار سا پیدا مجھے

کس قدر تاریک تھی یارب مری صبحِ نمود
آہ! اس ظلمت نے مجھ سے بھی چھپا رکھا مجھے

حالِ دل کس سے کہوں اے لذّتِ افشائے راز
ایک بھی اس دیس میں محرم نہیں ملتا مجھے

رہتے ہیں بے درد میری چشمِ تر پر خندہ زن ۔۔۔ اے دلِ درد آشنا تو نے کیا رسوا مجھے
یوں بگڑنا میری خود بینی پہ اب زیبا نہیں ۔۔۔ اپنی صورت پر کیا تھا تو نے کیوں شیدا مجھے
تر چلی آتی ہے کچھ صبحِ ازل سے اپنی آنکھ ۔۔۔ جب سے روتا ہوں کہ آتا بھی نہ تھا رونا مجھے
یاد دنیا کی کہاں باقی ہے اے اہلِ عدم ۔۔۔ ہاں یونہی سا یاد ہے کچھ اپنا مر جانا مجھے
ہے بسیرا اک نئی ڈالی پہ مدت سے مگر ۔۔۔ یاد آتا ہے پرانا آشیاں اپنا مجھے
موت میری یہ نہیں میری اجل کی موت ہے ۔۔۔ کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا مجھے

نادرِ نیرنگ ہیں اقبالؔ میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے[1]

○

چند روز ہوئے سیالکوٹ میں ایک تقریب تھی، یعنی وہاں کے رئیسِ اعظم آغا محمد باقر خاں صاحب قزلباش کے فرزندِ ارجمند محمد ناصر کے ختنے کے غسلِ صحت کی شادی منائی گئی تھی۔ وہاں شیخ محمد اقبال صاحب بھی مدعو تھے۔ کسی نے ایک مصرع طرح دیا، جس پر یہ غزل ہوئی اور اس غزل کو انھوں نے اپنے دوست کے بیٹے کی اس تقریبِ سعید کا سہرا قرار دیا۔ چنانچہ اس کی طرف مقطع میں اشارہ ہے۔ (مخزن ۱۹۰۳ء)

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے ۔۔۔ زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں، پیاری پیاری بولی ہے
ترا اے سیلِ دریائے محبت منہ تکوں کب تک ۔۔۔ مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

---

[1] "خدنگ نظر" بابت اگست ۱۹۰۳ء

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھا میرا
کہا بے درد نے "کیوں آپ نے مالا پرولی ہے"؟

جفا جو کہ دیا میں نے مگر تم نے برا مانا
خفا کیوں ہو گئے؟ یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شبِ فرقت تصوّر تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا؟
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب
پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے

تماشائی کوئی آئینۂ ہستی میں ہے اپنا
مزہ ہے حسن نے اے دل! کتابِ عشق کھولی ہے

سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری اجل نے آ کے کھولی ہے

جگت ایشر ہے تو ہر آتما کو پیت ہے تیری
صنم خانے کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے

ہمیں یادِ وطن! کیا پیش آتا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لیے غربت نوردوں کے ساتھ ہو لی ہے؟

تغیّر روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا نرگس!
بتا پھر کس کے نظّارے کو تو نے آنکھ کھولی ہے

تبسّم چاکِ جیبِ گل، ترنّم نالۂ بلبل
یہ بے مہروں کی باتیں ہیں، یہ بے دردوں کی بولی ہے

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے

یہ ہو گی شوخ اے صیّاد! مدّت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں آواز میری بھولی بھولی ہے

لہو کی بوندیاں لالے کی کلیاں بن کے پھوٹی ہیں
مگر زیرِ زمیں کھیلی ترے کشتوں نے ہولی ہے

دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے اے دل!
جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے

گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا
صبا نے غنچۂ گل! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے

گلِ مضموں سے اے اقبالؔ! یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

○

اس غزل میں کل دس شعر تھے۔ چھ بانگِ درا میں شائع ہوئے باقی چار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر — قیامت تھی بجلی تھی رفتار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو — مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی
ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں — الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی [1]

○

دل ترے شوق میں جب درد سے بے تاب ہوا — اشک جو آنکھ سے ٹپکا دُرِ نایاب ہوا
جوشِ ایماں جو دکھاؤں تو الٹ دوں یہ جہاں — دل نہ سینے میں ہوا قطرۂ سیماب ہوا
عقل کی فوج نے ہر جنگ میں منہ کی کھائی — عشق میدان میں آیا تو ظفریاب ہوا
کر نہ تقدیر کے شکووں سے خودی کو رسوا — بہرِ تدبیر عیاں عالمِ اسباب ہوا
ترے پرتو سے ہے ہر چیز میں نورِ ایماں — گلشنِ دہر ترے حسن سے شاداب ہوا
قلبِ انساں سے چلی آتی ہے فطرت کی صدا — خود کو جو جان گیا سمجھو خدایاب ہوا
اس کی اک ضرب سے ہو زلزلہ طاری ہر سُو — زورِ مسلم نہ ہوا، خیال ہوا خواب ہوا

---

[1] مخزن، جون ۱۹۱۰ء (اس غزل کے مزید اشعار ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیے)

کون جانے کہ قلندر ہے شہنشاہِ عشق ۔۔۔ فرش خاکی بھی مجھے فقر میں کمخواب ہوا

ہر ضرورت ہوئی پوری تو خدا سے اقبال
میں نہ تکلیف میں شرمندۂ احباب ہوا

○

جہاں زندگی ہے وہاں آرزو ہے ۔۔۔ جہاں آرزو ہے وہاں جستجو ہے
نہ ہو جستجو تو ہے ویرانہ عالم ۔۔۔ تری جستجو ہی تری آبرو ہے
نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے ۔۔۔ جسے دیکھتا ہوں وہی خوبرو ہے
مٹاتے ہیں الفاظ معنی کی شوکت ۔۔۔ مری بے زبانی مری گفتگو ہے
تری آرزو سے ملی وہ قناعت ۔۔۔ نہ کوئی ہوس ہے نہ کچھ آرزو ہے
خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی ۔۔۔ ترا حُسن دائم مرے روبرو ہے
نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ ۔۔۔ جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

وہ کیا شے ہے اقبال سینے میں تیرے
فرشتوں میں ہر دم تری گفتگو ہے

○

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام / سیر اس باغ میں کر بادِ سحر کی صورت
نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام / زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت
یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تری آنکھوں سے / کیا مروت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت
جوش میں بحرِ محبت تھا مگر دل اپنا / صاف نکلا نگہِ دیدۂ تر کی صورت
دہر میں ذوقِ سکوں تجھ کو ہے پیغامِ فنا / تازہ رکھ جوشِ سفر شمس و قمر کی صورت
ضربِ شمشیرِ حوادث سے نہ کھو قوتِ ضبط / سخت خوددار ہو دنیا میں سپر کی صورت
ہے گل و لالہ کی صورت تو انھیں سی لیکن / ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

○

حقیقت میں روحِ ابد ہے زمانہ / یہ امروز و فردا ہیں تیرا فسانہ
نہ ہو جب تلک دل میں ایمانِ کامل / خودی بھی فسانہ، خدا بھی فسانہ
خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے / غریبی میں انداز ہیں خسروانہ
فرنگی کی دنیا فسوں سامری کا / ادا دلبرانہ عمل ساحرانہ

سزا پانے والی ہے یورپ کی غفلت — کہ فطرت بھی رکھتی ہے اِک تازیانہ
نہ ہو گر یقیں دیکھ لے سر جھکا کر — ترے دل میں ہے دفن تیرا خزانہ
سفر میں نہ منزل کا رکھ کچھ تخیل — جلا دے کسی برق سے آشیانہ
کوئی مردِ مومن جگا دے یہ بستی — طریقے ہیں مشرق کے سب راہبانہ
پتنگے ہیں نابود اور شمع گریاں — ہوئی ختم حسرت پہ بزمِ شبانہ

سکھاؤ اب اقبالؔ کچھ قاہری بھی
بہت کہہ چکے قصۂ عاشقانہ

○

دل کی بستی عجیب بستی ہے — لوٹنے والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اصول — تنگ دستی فراخ دستی ہے
جنسِ دل ہے جہان میں کمیاب — پھر بھی یہ شئے غضب کی سستی ہے
تابِ اظہارِ عشق نے لے لی — گفتگو کو زباں ترستی ہے
ذکرِ جامِ طہورؔ، وعظ کا وعظ — مے پرستی کی مے پرستی ہے
شعر بھی اِک شراب ہے اے دل — ہوشیاری اسی کی مستی ہے
ہم فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوے — نیستی اک طرح کی ہستی ہے

آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا؟ ابر کی طرح سے برستی ہے

دیکھیے کیا سلوک ہو اقبالؔ

مجرمِ جرمِ بت پرستی ہے[1]

○

ہے کلیجا فگار ہونے کو دامنِ لالہ زار ہونے کو

کیا ادا تھی وہ جاں نثاروں میں تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لیے خوب سمجھے شکار ہونے کو

عشق وہ چیز ہے کہ جس کو قرار چاہیے بے قرار ہونے کو

یارِ جانی کہیں نہیں ملتا یوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

لالہ اور داغِ دل بہانہ ہے دل جلوں میں شمار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو، توبہ کھل گیا بستہ کار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے کس کی رہ کا غبار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ ہے مجھے اعتبار ہونے کو

اس نے پوچھا یہ کون چھپتا ہے ہم چھپے آشکار ہونے کو

ہم نے اقبالؔ عشق بازی کی

پی یہ مے ہوشیار ہونے کو[2]

---

[1] مخزن، مارچ ۱۹۰۲ء [2] مخزن، جون ۱۹۰۲ء

○

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا — وہ سمجھتے ہیں کہ جُرمِ ناشکیبائی ہوا
غیر سے غافل ہوا میں اے نمودِ حسنِ یار — عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا
میری بینائی ہی شاید مانعِ دیدار تھی — بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا
ہائے میری بدنصیبی، وائے ناکامی مری — پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا
میں تو اس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا — مَا عَرَفْنَاکَ کہے جو تیرا تمنائی ہوا
تجھ میں کیا اے عشق وہ اندازِ معشوقانہ تھا — حسن خود لولاک کہہ کر تیرا شیدائی ہوا
دیکھ ناداں امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر — حسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا
اب مری شہرت کی سوجھی ہے انھیں دیکھے کوئی — پس کے میں جس دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا

بغضِ اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو
دِق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

○

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں — اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں
نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے — کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں
کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل — محبت کو آزادگی جانتے ہیں

حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے کہ جو حُسن کو عارضی جانتے ہیں

جو ہے گلشنِ طور اے دل تجھے ہم
اسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں[1]

○

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم
اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی اتنی سی بات کے لیے محشر میں جائیں ہم؟
اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اٹھائیں ہم
پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیبِ عشق
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم[2]

---

[1] "مخزن" جولائی سنہ ۱۹۰۱ء [2] "مخزن" جنوری سنہ ۱۹۰۳ء

بعض غزلوں کے حذف شدہ اشعار

جلوۂ گل کا ہے اک دام نمایاں بلبل　　اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی
ہم نوا لذتِ آزادیِ پرواز کجا　　بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

مارچ ۱۹۰۷ء کے "مخزن" میں اقبال کی ایک غزل شائع ہوئی تھی، جو انھوں نے کیمبرج سے بھیجی تھی اس کے کل اٹھارہ شعر تھے۔ نظرِ ثانی میں دسواں شعر حذف کر دیا گیا، جو یہ تھا:

جنھوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستاں صدا کا جانا　　مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا[1]

جو نکلا نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے　　وہی نکہت چمن سے اُڑ کے جا چمکی ستارے میں
مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا　　تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں
اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو　　ملا وہ لطفِ آزادی مجھے ترے سہارے میں

نہاں تھا تو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا　　مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں[2]

۱۔ "مخزن" مارچ ۱۹۰۷ء　　۲۔ "مخزن" دسمبر ۱۹۰۶ء

اڑایا ذوقِ تپش پتنگے سے، شمع سے شوقِ اشکباری   کہیں سے سیکھی نماز میں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا
جو چاک میرے جگر کے دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پوچھا   یہ آدمی ہے کہ گُل ہے؟ منت پذیر ہے سوزنِ رفو کا[1]

اے تماشائی مری پستی کا نظّارہ تو دیکھ   اسفلِ عالی نظر ہوں ناقصِ کامل ہوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق   دل سے کہتا ہے جگر تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

تجھ میں پوشیدہ ہے لیلیٰ اور ہے لیلیٰ کوئی   کہ رہا ہے دل ترا لیلیٰ نہیں محمل ہوں میں
کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی   پھونک ڈالی اپنی کھیتی آہ کیا غافل ہوں میں
میں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل روزِ الست   اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بیدل ہوں میں
ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش   مجھ پہ آ گر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز   سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں
تخم ریزی جس کی ہنگامِ صدائے کُن ہوئی   اس پرانے مزرعِ زرخیز کا حاصل ہوں میں

---

[1] "مخزن" اپریل ۱۹۰۶ء

ہاں اے شرابِ عشق یہ دن ہیں نمود کے — ایسی اچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے
مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ — یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے[1]

دیکھ لیتا ہوں جہاں تنکا کوئی چبھتا ہوا — میں اٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کے لیے
ہم صفیرو تم مری عالی نگاہی کو دیکھنا — شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لیے
قصہ خواں نے کیوں سنا دی داستاں مجھ کو مری — رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے؟

عشق نے مٹی کو مسجودِ ملائک کر دیا — ورنہ انساں اور فرشتے سر جھکانے کے لیے

صبحِ پیدائش یہ کہتا تھا کسی کو دردِ عشق — آنکھ رونے کے لیے دل ٹوٹ جانے کے لیے
ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں[2] کو سنانے کے لیے

تھا دکھانے دیکھنے کا کچھ تقاضا طور پر — کچھ خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیوں کر ہوا

---

[1] "مخزن" مئی ۱۹۰۵ء۔

[2] ہمایوں سے مراد میاں شاہ دین ہیں، جن کا تخلص ہمایوں تھا۔ "مخزن" نومبر ۱۹۰۱ء

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیوں کر ہوا

موت کی ظلمت میں پنہاں ہے شرابِ زندگی مر گیا ہوں یوں تو لیکن میں فنا کیوں کر ہوا

یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبالؔ تم دل تمہارا اس قدر درد آشنا کیوں کر ہوا[1]

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

مری جاں نہیں ربط غیروں سے اچھا بھلا میں تمہارا بُرا چاہتا ہوں

مجھے جلوۂ گل ہے برقِ تجلّی سنبھالو مجھے میں گرا چاہتا ہوں
نہ کوثر کا خواہاں، نہ حوروں کا شیدا خدا جانے میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں
اُگوں، سبز ہوں، پس کے ہوں خون آخر میں قسمت مثالِ حنا چاہتا ہوں
شجر ہوں گری مجھ پہ برقِ محبت ہرا ہو گیا ہوں پھلا چاہتا ہوں
مری جاں تری بے حجابی سے پہلے تری دید کا حوصلا چاہتا ہوں

---

[1] "خدنگ نظر" فروری ۱۹۰۳ء

محبت مٹا دے گی بیگانگی کو / سنبھل بیٹھ میں تو ہوا چاہتا ہوں
ہوا خاک میں اے ہوائے محبت / مدینے کی جانب اڑا چاہتا ہوں
چلو مل کے اقبالؔ کے گھر کو ڈھونڈیں
کہ میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں[1]

اثر غضب کا دعائے قدح میں ہے ساقی / کوئی اسے بھی ذرا داخل نماز کرے
جواب ملتا ہے لولاک ما عرفنا کا / کوئی جو عجز کے دامن کو یاں دراز کرے
پرانے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر / مدینہ وہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے
شعاعِ نور کو تاریکیِ جہاں میں نہ ڈھونڈ / یہی ہے شمع اگر دل کو تو گداز کرے
نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں / یہ عشق وہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے

میں تاریکی ہوں لیکن مجھ میں پوشیدہ وہ گوہر ہے / جھلک جس کی عیاں ہے اے فلک تیرے نگینوں میں
کہیں لیلیٰ نے شاید دیکھ پائی ہے جھلک تیری / کہ محمل سے نکل کر جا ملی صحرا نشینوں میں
میں اے خضرِ محبت ڈھونڈتا ہوں اس ولایت کو / جہاں سبزے کی صورت طور اُگتے ہیں زمینوں میں

حباب آسا ہرِ موجِ نفس باندھا ہے محمل کو / ذرا دیکھ اے شررِ ذوقِ فنا مجھ کو کہاں تک ہے

---

١ "مخزن" جنوری ١٩٠٤ء

وہی اک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمعِ تربت بھی
مزا مرنے کا کچھ پروانۂ آتش بجاں تک ہے

نہ سیکھی تو نے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی
یہ قیدِ بوستاں بلبل خیالِ آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں
نظر آسا مری وحشت میں بے تابی کہاں تک ہے

ہیں خار خشک ہم پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں
پڑے رہنا مرا گلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

مثالِ عکس بے تارِ نفس ہے زندگی میری
تری آسیب کاری اے اجل اقلیمِ جاں تک ہے

زباں تک عقدہ تبخالہ بن کر رہ گیا مطلب
اثر مجھ دل جلے کی بستہ کاری کا کہاں تک ہے

جرس ہوں میں صدا خوابیدہ ہے میرے رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

نہیں منت پذیرِ چشم رونا شمعِ سوزاں کا
سمجھ غافل گدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے

بھلا اے گل کبھی اس رمز کو تو نے بھی سمجھا ہے؟
تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ نامِ مرتضےٰؓ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے [1]

---

[1] "مخزن" اکتوبر ۱۹۰۳ء

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر　　مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی
دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے　　اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی
بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا　　کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی
ہم جانتے ہیں میم کے پردے ہیں کون ہے　　ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھپایا کرے کوئی
صبح ازل یہ دردِ محبّت نے دی صدا　　مجھ کو بھی ساتھ حسن کے پیدا کرے کوئی
محفل میں شغل مے ہو شب ماہتاب ہو　　اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی
اقبالؔ عشق نے ترے سب بل دیئے نکال　　مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

بیابانوں میں اے دل اہلِ دل کی جستجو کیسی　　کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں
غضب کے من چلے ہیں جنسِ دل کے بیچنے والے　　یہ اپنے مال کے ساتھ آپ بھی بِک جانے والے ہیں

پتہ یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا　　ہمیں معلوم ہے اے دل جہاں کے رہنے والے ہیں
پلادی اس کو کیا مے ساقیِ بادِ بہاری نے　　زبانِ برگِ گل پر قطرۂ شبنم کے چھالے ہیں
نہ دیکھ اے دیدۂ خونبار دل کو کم نگاہی سے　　ترے آنسو اسی اجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں

دعا دیتا ہوں، روتا ہوں، گلہ کرتا ہوں قسمت کا　　ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنّا کے نکالے ہیں
الٰہی کون سا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا　　امیدوں کے شجر، زخموں کے گل، داغوں کے لالے ہیں

نہیں کچھ امتیازِ ما و تو شہرِ محبّت میں　　نرالا دیس ہے دستور ہی یاں کے نرالے ہیں
نشانِ ماہِ کنعاں اے زلیخا پوچھ لے مجھ سے　　کہ میں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں

قصائد

شکریہ

اقبالؔ حیدر آباد دکن گئے تھے تو وہاں انھوں نے دو نظمیں لکھیں، ایک "گورستانِ شاہی" جسے مسٹر اکبر نذر علی (بعد میں نواب حیدر یار جنگ، سر اکبر حیدری) اور ان کی بیگم صاحب سے منسوب کیا، دوسری نظم یہ تھی۔ اسے اصطلاحی معنی میں قصیدہ نہ کہنا چاہیے۔ یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد سے اقبالؔ کے تعلقات پہلے بھی خاصے دوستانہ تھے۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں مہاراجہ نے اقبالؔ کے اعزاز میں خاص اہتمام کیا۔ اس دوستانہ التفات کے شکریے میں یہ شعر لکھے گئے۔ ان میں سے ابتدائی نَو شعر "نمودِ صبح" کے زیرِ عنوان "بانگِ درا" میں شامل ہو چکے ہیں۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر، جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میاں کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوش گوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظّارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا، اے ہم صفیر آیا ترا
کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیّاد نے تجھ کو شکار

کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش
کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب
ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا راز دار

پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے
دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خار زار

غنچۂ نو خیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں
ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلّی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا! میرا گزار

جس کے ذرّے مہرِ عالم تاب کو سامانِ نور
جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

خطۂ جنّت فضا جس کی ہے دامن گیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار

جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئنہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گزر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اُس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اس کی تقریروں سے روشن گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیِ معنی کا محمل اس کی نثرِ دل پذیر
نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اس کے فیضِ پا کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروت کا یونہی لا انتہا
جس طرح ساحل ہے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دل ربا اُس کا تکلّم خُلق اُس کا عطرِ گُل
غنچۂ گل کے لیے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبّر کو کہاں
جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دستِ وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احسان کا اے اقبال! لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

دربارِ بہاول پور

نومبر ۱۹۰۳ء میں رکن الدولہ نصرت جنگ مخلص الدولہ حافظ الملک ہز ہائی نس نواب محمد بہاول خاں پنجم عباسی کو وائسرائے نے خود اپنے ہاتھوں سے مسندِ سلطنت پر بٹھایا اور زمامِ اختیارات ان کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں جو جشن ریاست میں منایا گیا، وہ مدتوں یادگار رہے گا چونکہ ہز ہائی نس کے والد ماجد اس زمانے میں وفات پا گئے تھے، جب ہز ہائی نس کا سن مبارک بلوغ کو نہ پہنچا تھا، اس لیے ریاست میں انتظام کونسل آف ریجنسی کے ذریعے سے جاری رہا۔ اختیاراتِ حکومت ملنا ریاست کی تاریخ میں بہت بڑا واقعہ تھا۔ اس لیے رؤسائے عالی تبار اور راجگان ذی شان کے علاوہ ہر فرقے اور طبقے کے منتخب لوگ بھی اس تقریبِ سعید میں شریک تھے! اقبالؔ سے قصیدے کی فرمائش کی گئی تھی اور انھیں بطورِ خاص اس تقریب پر بلایا گیا تھا لیکن وہ رخصت نہ ملنے کے باعث جا نہ سکے۔ قصیدہ نومبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ آخر میں اس کا صحیح خاکہ پیش کیا ہے۔

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں
آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکے میں سر زمیں

انتہائے نور سے ہر ذرہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے ہیں اور مصدر زمیں

لے کے پیغامِ طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس[1] کے شانوں پر زمیں

شوق بک جانے کا ہے فیروزۂ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لیے گوہر زمیں

بسکہ گلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابرِ بہار
ہے شگفتہ صورتِ طبعِ سخن گستر زمیں

---

[1] یونانی اساطیر کے مطابق وہ دیو پیکر عفریت جو زمین کو کندھوں پر سنبھالے کھڑا ہے۔

برگِ گُل کی رگ میں ہے جنبش رگِ جاں کی طرح
ہے امینِ اعجازِ عیسیٰؑ کی کہ افسوں گر زمیں

خاک پر کھینچیں جو نقشہ مرغِ بسم اللہ کا
قوّتِ پرواز دے دے حرفِ قُم کہہ کر زمیں

صاف آتا ہے نظر صحنِ چمن میں عکسِ گل
بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشن گر زمیں

اس قدر نظّارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض
خاک سے کرتی ہے پیدا چشمِ اسکندر زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصودِ چمن
خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہِ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھوئے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمیں

چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ عمِّ پیغمبرؐ زمیں[1]

زینتِ مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزادِ احسانِ شہِ خاور زمیں

یعنی نوابِ بہاول خاں، کرے جس پر فدا
بحر موتی، آسماں انجم، زر و گوہر زمیں

جس کے بدخواہوں کی شمعِ آرزو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں

جس کی بزمِ مسند آرائی کے نظّارے کو آج
دل کے آئینے سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

فیضِ نقشِ پا سے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق
شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر زمیں

جس کی راہِ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا
کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک، محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی امیدگاہ
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں[2]

---

[1] بہاول پور کے فرمانروا چونکہ نسلاً عباسی ہیں، اس لیے بہاول پور کو عمِ پیغمبرؐ یعنی حضرت عباسؓ کی یادگار کا پایۂ تخت قرار دیا۔

[2] بہاول پور کے فرمانروا مسلمانانِ پنجاب کے قومی کاموں میں دریادلی سے حصّہ لیتے تھے، اس لیے انھیں قوم کی امیدگاہ قرار دیا۔

جس کے فیضِ پا سے ہے شفاف مثلِ آئنہ — چشمِ اعدا میں چھپا کر خاک کا عنصر زمیں
جس کے ثانی کو نہ دیکھے، مدتوں ڈھونڈے اگر — ہاتھ میں لیکر چراغِ لالۂ احمر زمیں

وہ سراپا نور اک مطلع خطابیہ پڑھوں
جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلعِ خاور زمیں

اے کہ فیضِ نقشِ پا سے تیرے گل بر سر زمیں — اے کہ تیرے دم قدم سے خسروِ خاور زمیں
اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بہ جیب — اے کہ ہے تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں
لے کے آئی ہے برائے خطبۂ نامِ سعید — چوبِ نخلِ طور سے ترشا ہوا منبر زمیں
تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈوبا ہوا — جانتی ہے مہر کو اک مہرۂ ششدر زمیں
ہے سراپا طور عکسِ رائے روشن سے ترے — ورنہ تھی بے نور مثلِ دیدۂ عبہر زمیں
مایۂ نازش ہے تو اس خانداں کے واسطے — اب تلک رکھتی ہے جس کی داستاں ازبر زمیں
ہو ترا عہدِ مبارک صبحِ حکمت کی نمود — وہ چمک پائے کہ ہو محسودِ ہر اختر زمیں
سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا — ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی سرزمیں
محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کج روی — کلیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں
صلح ہو ایسی، گلے مل جائیں ناقوس و اذاں — ساتھ مسجد کے رکھے بت خانۂ آذر زمیں
نامِ شاہنشاہ اکبر زندۂ جاوید ہے — ورنہ دامن میں لیے بیٹھی ہے سو قیصر زمیں
بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پروری — ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں
ہے مروت کی صدف میں گوہرِ تسخیرِ دل — یہ گہر وہ ہے کرے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مستِ شرابِ عیش و عشرت ہو اگر — آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں
عدل ہو مالی اگر اس کا یہی فردوس ہے — ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں
ہے گل و گلزار محنت کے عرق سے سلطنت — ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیوں کر زمیں
چاہیے پہرا دماغِ عاقبت اندیش کا — بے دری میں ہے مثالِ گنبدِ اخضر زمیں
لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبال کی — عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اڑ کر زمیں
خاندان تیرا رہے زیبندۂ تاج و سریر — جب تلک مثلِ قمر کھاتی رہے چکر زمیں
مسندِ احباب رفعت سے ثریا بوس ہو — خاک رختِ خواب ہو اعدا کا اور بستر زمیں
تیرے دشمن کو اگر شوقِ گل و گلزار ہو — باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں
ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیرِ خاک — مانگ کر لائے شعاعِ مہر سے خنجر زمیں
پاک ہے گردِ غرض سے آئنہ اشعار کا — جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر کا خیر مقدم

انجمن حمایت اسلام کے ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں اس زمانے کے لفٹنٹ گورنر نیز ولیم بل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات بھی آئے تھے۔ خان بہادر برکت علی خاں جلسے کے صدر تھے۔ اس موقع پر اقبال نے یہ نظم پڑھی تھی۔ واضح رہے کہ یہ ۱۹۰۲ء کا زمانہ ہے جب انجمن کے اجلاس میں لفٹنٹ گورنر اور ڈائرکٹر کی آمد کو بہت بڑا اور نہایت اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا۔

زہے نشاطِ فراواں کہ اخترِ تقدیر
چمک رہا ہے ابھر کر مثالِ مہرِ منیر

کیا ہے آنکھ نے ممدوح انتخاب ایسا
صفت سے جس کی زبانِ قلم میں ہے تاثیر

خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینتِ بزم
کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر

وہ کون زیب دہِ تختِ صوبۂ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصرِ عدل کی تعمیر

عجب معاملہ ہے کچھ ولایتِ دل کا
کہ اک نگاہ سے ہوتا ہے یہ نگرِ تسخیر

حضور زینت محفل ہیں ناز ہے ہم کو
جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزیِ کشمیر

مزے سے سوتا ہے بے خوف دیدۂ عالم
کہ تیرے عہد کا ہے خواب بھی نکو تعبیر

بدل کے امن کے باعث ہے اصطلاحِ زباں
بجائے نالۂ زنجیر، نغمۂ زنجیر

کوئی جو غور سے دیکھے تو امن کی ہے بہار
یہ درس گاہ یہ محفل یہ شان، یہ تعمیر

جو بزم اپنی ہے طاعت کے رنگ میں رنگیں
تو درس گاہ رموزِ وفا کی ہے تفسیر

لفٹنٹ گورنر سر ولیم میکورتھ ینگ ہفتہ ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء

اسی اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں | نہیں ہے غیرِ اطاعت جہان میں اکسیر
مدد جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی | غریب دل کے ہیں، لیکن مزاج کے ہیں امیر
مگر حضور نے ہم پر کیا ہے وہ احساں | کہ جس کے ذوق سے شیریں ہوا لبِ تقریر
وہ لوگ ہم ہیں کہ نیکی کو یاد رکھتے ہیں | اسی سبب سے زمانے میں اپنی ہے توقیر
دعا نکلتی ہے دل سے حضور شاد رہیں | رہیں جہان میں عظمت طرازِ تاج و سریر
عجب طرح کا نظارہ ہے اپنی محفل میں | کہ جس کے حسن پہ نازاں ہے خامۂ تحریر
ہوے ہیں رونقِ محفل جناب ولیم بل[۱] | ضیاے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر
یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ | انھیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر
خدا انھیں بھی زمانے میں شادکام رکھے | یہ وہ ہیں دہر میں جن کا نہیں عدیل و نظیر
قمر کے گرد ستارے ہیں ہم عناں کیا ہیں | ہے جس طرح کا شہنشہ اسی طرح کے وزیر
خوشا نصیب کہ یہ ہمرہِ حضور آئے | ہماری بزم کی یک بار بڑھ گئی توقیر

بڑھے جہان میں اقبال ان مشیروں کا
کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

۱؎ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب۔

مراثی

اشکِ خوں

ایک سو دس شعر کا یہ ترکیب بند مسلمانوں کے اس ماتمی جلسے میں پڑھا گیا تھا جو ملکہ وکٹوریا کی وفات پر لاہور میں منعقد ہُوا تھا۔ وکٹوریا ۲۲۔ جنوری ۱۹۰۱ء کو فوت ہوئی تھی اور اس روز عید الفطر تھی۔ جلسہ غالباً ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو منعقد کیا گیا ہوگا۔ گویا اقبال نے یہ نظم بڑی حد تک ارتجالاً لکھی۔ موضوع کے باب میں کچھ عرض کرنا غیر ضروری ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ملک کے سیاسی افکار و تصورات کا جو رنگ، جو انداز اور جو اسلوب تھا، اسے جانچنے کے لیے دس پندرہ سال بعد کا یا آج کا پیمانہ استعمال کرنا اتنا ہی غیر مناسب ہوگا جتنا کہ افلاطون یا بو علی سینا جیسے حکیموں کی زندگی سے بچپن اور طفولیت کا عہد خارج کر دینا غیر مناسب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کی عام جماعتوں اور قوموں کا طریق فکر و نظر وہ نہ تھا جو بعد میں اختیار کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں خواجہ حالی مرحوم کا مرثیہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو انھوں نے ملکہ وکٹوریا کی وفات پر لکھا اور رسالہ "معارف" پانی پت، بابت جنوری ۱۹۰۱ء میں شائع ہُوا تھا۔

موضوع سے قطع نظر کرتے ہوے اس نظم کی چند خصوصیتیں خاص توجہ کی مستحق ہیں اور انھیں خصوصیتوں کی بنا پر اسے محفوظ کر لینا حد درجہ ضروری معلوم ہُوا مثلاً:

۱۔ یہ نظم ابتدائی دور میں بھی اقبال کی قادر الکلامی اور اس کے فکرِ فلک پیما کی دل آویزیوں کا ایک نہایت عجیب مرقع ہے۔

۲۔ موضوع حد درجہ محدود تھا لیکن فکرِ اقبال نے اپنے خداداد کمالات کی بنا پر اس میں ایسے پہلو پیدا کر لیے کہ بالغ نظر شعر فہم انھیں دیکھ کر یقیناً سراپا حیرت بن جائے گا۔ گویا یہ نظم بھی عظمتِ اقبال کی ایک ایسی دستاویز ہے کہ اس کی مثالیں دنیاے ادب میں بہت ہی شاذ ملیں گی۔

۳۔ چوتھے بند میں اقبال نے حکمران یا ہیئتِ حاکمہ کے جو اوصاف و خصائص بیان کیے ہیں انھیں لاریب مثالی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے روشن ہو جاتا ہے کہ اقبال ابتدائی دور میں بھی حقائق شناسی

کے اس بلند مقام پر فائز تھے، جو دوسروں کو عمریں سعی و کوشش میں بسر کر دینے کے بعد بھی بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اغلب یہی ہے کہ حکمرانی کا یہ مثالی نقشہ پیش کرنے ہی کی آرزو مرثیے کی محرک ہوئی۔ معلوم ہے کہ شاعر کے لیے دنیا کے تمام سانحے محض اپنے دل کی باتیں کہنے کا بہانہ ہوتے ہیں۔

۴۔ اقبال کے نزدیک حکمرانی کی شان یہ ہے کہ دوسروں کے غم میں آنکھیں آنسوؤں سے تر رہیں، غریبوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ عوام کے دُکھ درد میں دل تڑپے۔ حقیقی حکمران وہ ہے جو عوام کی خوشی سے خوش اور عوام کے غم سے غمگین ہو۔ اس کی ڈھال ہر تلوار کی ضرب اپنے اوپر روکے۔ اس کے دل کا پیالہ محبت کی شراب سے لبریز ہو۔ اس کی ہر بات ایسی پاکیزہ ہو گویا وہ جبرئیلِ امیں کی صدا ہے۔ وہ معاملات کا فیصلہ ایسے رنگ میں کرے گویا تقدیر کی مراد وہی تھی۔ ایسی حکمران کا فرمان دلوں کی ولایت میں وہ حیثیت پیدا کرتا ہے جو نگاہوں میں نور کو حاصل ہوتی ہے۔ زرّیں تاج پہن لینے سے کیا بنتا ہے۔ ظاہری شان و شکوہ بادشاہی کا نشان نہیں۔ سچا حکمران وہ ہے جس کا تخت دلوں کی اقلیم میں آراستہ ہو۔ جن خوش نصیبوں کو دلوں پر راج کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے، وہ ہزار صدیاں گزر جانے پر بھی زندہ رہتے ہیں، اس لیے کہ ان کی محبت بھری یاد کا چراغ دلوں میں روشن رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کا مرثیہ لکھنے میں اقبال کا انداز ہمیشہ دوسروں سے مختلف رہا اور یہ خصوصیت ان کے تمام مرثیوں میں بدرجۂ کمال نمایاں ہے۔

بعض اشعار معمولی تشریح کے طلب گار تھے۔ میں نے حواشی میں جا بجا تشریح کر دی ہے۔ یہ مرثیہ مطبع خادم التعلیم میں چھاپ کر کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ کتابچہ صدیق عزیز مولوی محمد عبداللہ قریشی کے پاس محفوظ تھا۔ انھیں کی مہربانی سے مجھے ملا جس کے لیے موصوف دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

بند اوّل

اے آہ آج برقِ سرِ کوہسار ہو | یا تیر بن کے میرے کلیجے کے پار ہو
ہو ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ کے اے رشتۂ نفس | اے مرغِ روح، بازِ اجل کا شکار ہو
اے دامنِ دریدۂ پیراہنِ حیات | ہاں آج زیبِ دیدۂ خونابہ بار ہو
پھرتے ہیں ڈھونڈتے اجلِ ناگہاں کو ہم | ہاں اے حیاتِ خضر نگاہوں میں خار ہو
اے افسری کے تاج گریباں کو چاک کر | اے کرسیِ طلائے شہی سوگوار ہو
اے دل اگر جفا طلبی کا مذاق ہے | مرہونِ تلخیِ ستمِ روزگار ہو
پسنے کا جب مزا ہے کہ اے آسیائے غم | پس پس کے جان اپنی مثالِ غبار ہو
میّت اٹھی ہے شاہ کی تعظیم کے لیے | اقبال اُڑ کے خاکِ سرِ رہگزار ہو
مدت کے بعد تجھ کو ملے ہیں غمِ فراق | ہم تجھ پہ صدقے جائیں تو ہم پر نثار ہو
چلتے رہِ حیات، مگر گھات میں خوشی | کونے لگی ہوئی نہ سرِ رہگزار ہو

آئی ادھر نشاط، ادھر غم بھی آگیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آگیا[1]

۱؎ واضح رہے کہ ملکہ کا انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوا تھا اور تقویم کے رُو سے اُس دن عید الفطر تھی۔ اس شعر اور اگلے بند کو سمجھنے کے لیے اس واقعے کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

بندِ دوم

ہاں اے ہلالِ عید خدا کی قسم تجھے
خواہانِ عیش کیا نظر آتے ہیں ہم تجھے؟

اے جامِ بزمِ عید مقدر یہ تھا ترا
لبریز کرنے آئے مئے اشکِ غم تجھے

ایسی گھڑی میں تیری افق پر ہوئی نمود
سمجھا کوئی نہ حلقۂ ماتم سے کم تجھے

ایمن تھے غم سے ہم مگر اے خنجرِ ستم
کرنے تھے ذبح طائرِ بامِ حرم تجھے

کھلتی ہے کچھ ہمارے مقدر پہ یہ کجی
سجتا نہیں نظر میں ہماری یہ خم تجھے[1]

تیغِ ستم سے بڑھ کے رہیں تیری تیزیاں
ہم اپنے لب سے مانگ کے دیتے ہیں دم تجھے

بیمارِ نشاط اگر ہے تو صبحِ غم
پڑھ کر کرے گی سورۂ والحشر دم تجھے[2]

ہاں اے شعاعِ ماہِ شبِ اولِ طرب
دل جانتا ہے تیرِ کمانِ ستم تجھے

صورت وہی ہے نام میں رکھا ہوا ہے کیا
دیتے ہیں نام ماہِ محرم کا ہم تجھے

اے شامِ عید اپنے مہِ نو سے پوچھ لے
سمجھا ہوا ہوں صبحِ دیارِ عدم تجھے[3]

---

[1] یعنی خم تیرے لیے زیبا معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے تو ہمارے مقدر کی کجی کا کچھ کچھ اظہار ہوتا ہے۔ [2] یعنی اے ہلالِ عید تو اگر خوشی کی بیماری میں مبتلا ہے تو غم کی صبح تجھ پر الحشر پڑھ کر دم کرے گی تاکہ تجھے اس بیماری سے نجات مل جائے۔ معلوم ہے کہ ہمارے ہاں رفعِ مرض کے لیے دم کرنا بھی معمول رہا ہے۔ [3] اس بند میں ہلال کی تشبیہات پر نظر رکھیے۔ اس ابتدائی دور میں بھی اقبال کی یہ خصوصیت قابلِ توجہ ہے کہ وہ مناظرِ قدرت کو اپنے تاثرات کا جامہ پہنا کر نظم کو بے حد پُر تاثیر بنا دیتے تھے۔ اِس خصوصیت میں کوئی دُوسرا شاعر اس پیمانے پر ان کا شریک نہ تھا۔ اسی سال انھوں نے "انجمن حمایتِ اسلام" کے لیے "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" لکھی۔ اس میں ہلال کے لیے بالکل نئی تشبیہات پیدا کیں۔

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہُوا کرے
اِس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

بند سوم

قربان تیرے اے ستمِ روزگار آج
آنکھوں میں ہر نگہ بھی ہوئی اشکبار آج
اس روز رنج و غم سے تو آسان تھی یہی
محشر کی صبح ہو نہ گئی آشکار آج
دل کا تو ذکر کیا ہے کہ دل کا قرار بھی
سیماب کی طرح سے ہُوا بے قرار آج
سوزِ الم نے جاں کو جلایا ہے اس طرح
کانونِ دل سے اٹھتے ہیں غم کے شرار آج
ناکامیوں نے اس کو سُنادی وہ کیا خبر
امید دل میں ہوتی ہے دیوانہ وار آج
ہاں اے دلِ حزیں المول کا یہ دَور ہے
ہو طوفِ شمعِ غم تجھے پروانہ وار آج
مثلِ سموم تھی یہ خبر کس کی موت کی
گلزارِ دل میں آ کے لگے غم کے خار آج
پژمُردہ ہو گیا گلِ بستانِ افسری
خوں ہو رہی ہے باغِ جہاں میں بہار آج
اقلیمِ دل کی آہ شہنشاہ چل بسی
ماتم کدہ بنا ہے دلِ داغ دار آج
تو جس کی تخت گاہ تھی اے تخت گاہِ دل
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاج دار آج
فرماں نہ ہو دلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
سونے کا تاج کوئی نشانِ شہی نہیں

بند چہارم

شاہی یہ ہے کہ اَور کا غم چشمِ تر میں ہو
شاہنشہی یہ شانِ غریبی نظر میں ہو

شاہی یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو ہوں اَور کے
چلائے کوئی، درد کسی کے جگر میں ہو

غم دل میں اُور کا ہو خوشی دل میں اَور کی
کوئی گرے، شکست کسی کی کمر میں ہو

بےتابیاں جو اَور کی ہوں اپنے دل میں ہوں
جو درد اَور کا ہو، وہ اپنے جگر میں ہو

پامالِ فکرِ غیر رہے تخت گاہ پر
آئے کسی پہ تیغ، کسی کی سپر میں ہو[1]

معمور ہو شرابِ محبت سے جامِ دل
جو دل میں ہو نہاں وہ نمایاں نظر میں ہو

جو بات ہو، صدا ہو لبِ جبرئیل کی
تقدیر کی مرادِ دلِ دادگر میں ہو

ہو چشمِ معدلت کے ستارے کی روشنی
مانگے اماں عدو تو مروت نظر میں ہو

شہرت کے آسمان پہ روشن ہو اس طرح
ہو مہر میں وہ نور، نہ وہ ضَو قمر میں ہو

فرمان ہو دلوں کی ولایت میں اس طرح
جس طرح نورِ رشتۂ تارِ نظر میں ہو

اے ہند تیرے چاہنے والی گزر گئی
غم میں ترے کراہنے والی گزر گئی

---

[1] یعنی تخت پر بیٹھ کر بھی ہر وقت دوسروں کے خیال میں لگے رہیں۔ کسی پر تلوار کا وار ہو لیکن حکمران کی سپر ہر ایسے وار کو روکے۔

بند پنجم

اے بحرِ حکمراں جو زمینوں کی تھی گئی
آغوشِ موج جس کے سفینوں کی تھی گئی

موجیں رواں ہوں خون کی چشمِ حباب سے
وہ آبرو جو تیرے خزینوں کی تھی گئی

دُزدِ اجل کی تاک بھی کیسی غضب کی تھی
انگشتری جو دِل کے نگینوں کی تھی گئی

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا
اِک غمگسار تیرے مکینوں کی تھی گئی

اے ہند جو فضیلتِ نسواں کی تھی دلیل
تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی گئی

ہو سوگوار آج خواتینِ ہند تم
جو داستاں تمھارے شبینوں کی تھی گئی

خونابہ بار آج ہو اے چشمِ سلطنت
واقف جو تیرے سارے قرینوں کی تھی گئی

اے سالِ قرنِ نو[1] یہ ستم تو نے کیا کیا
عزت ذرا جو تیرے مہینوں کی تھی گئی

تو آج سر بہ خاک ہو سیّارۂ زمیں
رونق جو تیرے سارے مکینوں کی تھی گئی

صرفِ بکا ہے جانِ سلاطینِ روزگار
دہلیز جس کی عید جبینوں کی تھی گئی

ہو موت میں حیات، ممات اس کا نام ہے
صدقے ہو جس پہ خضر وفات اس کا نام ہے

بند ششم

جانِ نزار آ کے لبوں تک اٹک گئی
آنکھوں سے خون بن کے تمنّا ٹپک گئی

روزِ طرب جہاں میں سیہ پوش ہو گیا
اے روزگارِ غم تری قسمت چمک گئی

---

[1] یعنی نئی صدی کا پہلا سال۔

آئی جو پاس خنجرِ عریاں لیے ہوئے
ڈر کر امید گوشۂ دل میں دبک گئی

جادو نگاہ دیدۂ صیاد تھی کوئی؟
دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بلبل پھڑک گئی

اے شمعِ بزمِ ماتمِ سلطانۂ جہاں
کیا تھی جھلک تری کہ ثریا تلک گئی

ماتم بھی وہ دیا کہ ہزاروں میں ایک ہے
آنکھ اپنی انتخابِ فلک پر پھڑک گئی

لالیٔ افق پہ آنکھ نے دیکھی جو شامِ عید
اِک بات تھی کہ خونِ جگر کو کھٹک گئی

سمجھی ہے ایسے آپ کو آئی ہوئی اجل
لو میری خامشی سے قضا بھی بہک گئی

اے درد آمرے چمنِ دل کی سیر کر
غم کی کلی ہوائے نفس سے چٹک گئی

اے دردِ جاں گداز خدا کے لیے نہ تھم
ہم بھی اٹھیں گے ساتھ جو تیری کسک گئی

ہر آنکھ، دل بہ ریزشِ طوفاں نہادہ ہے
مژگانِ چشم کیا رگِ ابرِ گشادہ ہے

بندِ ہفتم

ماتم میں آرہے ہیں یہ ساماں کیے ہوئے
داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے

تاریک ہو گیا ہے زمانہ مگر قضا
آجائے غم کی شمع فروزاں کیے ہوئے

رکھتا ہوں طائرِ دلِ رنگیں نوا کو میں
پہلو کو غیرتِ چمنستاں کیے ہوئے

لکھتا ہوں شعر دیدۂ خونبار سے مگر
کاغذ کو رشکِ بابِ گلستاں کیے ہوئے

ماتم میں لے گیا ہوں دلِ پاش پاش کو
آزادِ جاں گدازیِ درماں کیے ہوئے

ہر زخمِ دل کو ماتمِ خاتونِ دہر میں | بیٹھے ہیں مستِ ذوقِ نمکداں کیے ہوے
مغرب کے آسماں پہ چمکتی ہے تیغِ غم | جوہر کو رازدارِ رگِ جاں کیے ہوے
لے اے عروسِ ہند تری آبرو گئی | آنکھوں کو اشکِ غم سے دُرافشاں کیے ہوے
برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو | سامانِ بحر ریزیٔ طوفاں کیے ہوے
بوتے ہیں نخلِ آہ کو باغِ جہاں میں ہم | ممنونِ آبِ دیدۂ گریاں کیے ہوے

آہم چو سرو در چمنِ روزگار ماند
ایں مصرعِ بلند زمن یادگار ماند

بند ہشتم

کیا منزلِ عدم کو ہمارا نفس گیا | یہ سب سے پہلے صورتِ بانگِ جرس گیا
آ اے ہجومِ غم ترے قربان جاؤں میں | اُجڑا ہوا تھا شہر مرے دل کا بس گیا
ہو ہو کے پرزے خارِ غمِ سینہ سوز سے | تن سے نکل کے دامنِ موجِ نفس گیا
ایسا اثر ہے گریۂ آہن گداز سے | اشکوں کے ساتھ مل کے ہمارا قفس گیا
اُٹھا وہ ابر گوشۂ مغرب سے شعلہ ریز | مشرق سے بڑھ کے ہند پہ آ کر برس گیا
وہ ضربِ غم لگی ہے کہ ٹوٹا ہے بند بند | کیا مرغِ روح توڑ کے اپنا قفس گیا
نکلا وہ مار صحنِ گلستانِ عیش سے | دل کو، جگر کو، سینے کو، پہلو کو ڈس گیا
اے روز تو پہاڑ تھا یا غم کا قرض تھا | دن بن کے تو چڑھا تھا پہ ہو کر برس[1] گیا

---

[1] یہاں "برس" بمعنی "سال" ہے، یعنی غم کے باعث دن سال کے برابر ہو گیا۔

لا گلشنِ عدم سے اسے اے سمومِ غم
بوئے گلِ اجمل کو مرا جی ترس گیا

آنکھوں کی راہ کیوں نہ گیا بن کے جوئے خوں
دم بھی گیا تو لے کے یہ جی میں ہوس گیا

شہرہ ہُوا جہاں میں یہ کس کی وفات کا
ہے ہر ورق سیاہ بیاضِ حیات کا

بندِ نہم

ہاں بھولنا نہ موجۂ بادِ سحر کہیں
ہو ملکِ نیستی میں جو تیرا گزر کہیں

مانگی تھی تم نے آج اجمل کے لیے دعا
صدقے نہ ہو گیا ہو دعا پر اثر کہیں

ٹلتی نہیں ہے شورِ بکا سے اجل کبھی
اس تیغ جاں ستاں کی نہیں ہے سپر کہیں

دونی تھی جن کی شان سے ہیروں کی آبرو
وہ آج کر گئے ہیں جہاں سے سفر کہیں

اے کوہِ نور تو نے تو دیکھے ہیں تاجور
دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟

دیتے ہیں تجھ کو دامنِ[1] کہسار کی قسم
اس شان کا ملا ہے تجھے دادگر کہیں؟

بن کر چراغ سارے زمانے میں ڈھونڈتا
کہنا ہمیں بھی آئے جو ایسا نظر کہیں

جس کی ضیا سے آنکھ چکا چوند تھی تری
دنیا میں اب نہیں وہ جبیں جلوہ گر کہیں

تو کیا کسی پہ گوہرِ جاں تک نثار تھے
پیدا جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بشر کہیں

صورت تری ہے اشک جگر سوز کی طرح
قربان ہو نہ جائے ہماری نظر کہیں

---

[1] کوہِ نور کو دامنِ کہسار کی قسم اس لیے دی کہ ہیرے پہاڑوں کے دامن ہی میں پرورش پاتے ہیں۔

ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اسی کا ہے
زینت تھی جس سے تجھ کو، جنازا اسی کا ہے

بند دہم

پیغامِ خانہ سوزیِ دل بار بار دے
فرصت نہ دو گھڑی نفسِ شعلہ بار دے
دَورِ جنوں میں جائے جو دشتِ عدم کو دل
پہلے قدم پہ جامۂ ہستی اتار دے
پھونکا ہے غم کی آگ نے جانِ نزار کو
ہم کو تسلیاں دلِ آشفتہ کار دے
جس کا دلوں پہ راج ہو مرتا نہیں کبھی
صدیاں ہزار گردشِ دوراں گزار دے
رہتا ہے دل میں صورتِ حرفِ نگیں وہ نام
شہرت جسے جہان میں پروردگار دے
وکٹوریا نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت
ہے زندگی یہی جسے پروردگار دے
اے غم گسارِ دودۂ شاہی خدا تمہیں
اس دردِ جاں گزا میں شکیب و قرار دے
رفتار اس کے نقشِ قدم پر کرے نصیب
یہ مہرِ مادری کی تمہیں یادگار دے
اے باغِ ہند تیرا خیاباں بجائے گل
موتی مثالِ دامنِ ابرِ بہار دے
پژمردہ کر گئی ہے جو بادِ خزاں تجھے
صد نو بہارِ ناز تجھے روزگار دے

مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو

محمد علی

(مولانا محمد علی مرحوم کی وفات پر)

یہ نظم سب سے پہلے روزنامہ "انقلاب" میں چھپی تھی۔ اقبال نے ابتدا میں صرف تین شعر لکھے تھے، پھر ان میں دو شعروں کا اضافہ کر دیا۔

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت[۱]
سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

---

[۱] یہ مصرع ابتدا میں یوں لکھا تھا:

مشتِ خاکش را بہ خاکِ پاکِ قدس آمیختند

مرثیہ اکبر الہ آبادی

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر | حیاتش بہ حق بود روشن دلیلے
سرِ ذرۂ طورِ معنی کلیمے | بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
نوائے سحرگاہِ او کارواں را | اذانِ درائے پیامِ رحیلے
ز دلہا بر افگندہ لات و عزیٰ | ز جانہا کشایندہ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

گرامی کی وفات پر

آہ! مولانا گرامی از جہاں بربست رخت | آنکہ ز فکرِ بلندش آسماں را پشت پائے
معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر | مثل حورے بے حجاب اندر بہشتے دلکشائے
از نوائے جانفزائے او عجم را زندگی | جامِ جمشید از شرابِ نابِ او گیتی نمائے
یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتم | اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنائے

بر مزارش پست ترکن پردہ ہائے ساز را
تا نہ گردد خوابِ او آشفتہ از شورِ نوائے

خواجہ حالی مرحوم کی صد سالہ یادگار

خواجہ حالی مرحوم کی صد سالہ یادگار کے موقع پر پانی پت میں بہت بڑا اجتماع ہوا تھا۔ اس موقع پر نواب حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال بھی تشریف لائے تھے اور دوسرے اکابر کے علاوہ اقبال بھی اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ یہ اشعار انھوں نے پہلے سے لکھ کر بھیج دیے تھے، جو اس تقریب میں پڑھے گئے۔ اقبال کی طبیعت علیل تھی اس لیے خود یہ اشعار نہ سنا سکے۔ یہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہ ہوئے۔ صرف صد سالہ برسی کی روداد میں چھپے۔

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می بینم ‎ ‎ چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو ‎ ‎ ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را ‎ ‎ نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگِ گل افشانم

ایک دوسرے موقع پر حالی سے متعلق مندرجۂ ذیل قطعہ کہا تھا:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بفسرد ‎ ‎ سید دگر او را نمے از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود ‎ ‎ تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

ماتمِ پسر

اس نظم کی کیفیت "مخزن" میں یوں چھپی تھی:

"ہمارے ایک عنایت فرما رئیسِ بارہ مولا علاقہ کشمیر، خواجہ عبدالصمد ککڑو ہیں۔ انھیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طباع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں، مگر اس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انھیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے ان کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درجِ ذیل ہے۔" ("مخزن" جولائی ۱۹۰۲ء)

خواجہ عبدالصمد قومی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں آتے تھے تو خوب چندہ دیتے تھے۔ خود بھی تقریریں کرتے تھے۔ نیز شاعروں اور مقرروں کی حوصلہ افزائی میں بھی سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اقبال سے انھیں بے حد محبت تھی۔ اقبال نے اسی تعلق کی بنا پر یہ نوحہ کہا تھا۔ جو خواجہ عبدالصمد کی زبان سے ہے۔ خواجہ غلام حسن مرحوم کا نام تھا۔

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا — وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار — نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور ہیں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا

بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہوں بلبل نہ کیوں — وہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا چرخ نے وہ غم فلک نے اسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

قطعات اور متفرق اشعار

مرگِ قوم

یہ اشعار منشی سراج الدّین صاحب میر منشی کشمیر ریزیڈنسی کی بیاض سے ملے۔ گویا اقبالؔ نے کسی موقع پر انھیں خط میں لکھ بھیجے تھے۔

فرد برمی خیزد از مشتِ گلے ۔۔۔ قوم زاید از دلِ صاحب دلے
فرد بہرِ شصت و ہفتاد ست و بس ۔۔۔ قوم را صد سال مثلِ یک نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن ۔۔۔ زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات ۔۔۔ مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

قطعہ

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگِ یورپ ختم ہوئی۔ اس کے بعد فتح کے جشن میں ایک زبردست مشاعرہ منعقد ہوا (۱۵-۱۶ دسمبر ۱۹۱۸ء) اوڈوائر کی فرمایش پر اقبالؔ کو دوبارہ اس مشاعرے میں آنا پڑا۔ اس میں یہ اشعار سنائے تھے۔ "شعاعِ آفتاب" کے عنوان سے جو نظم "بانگِ درا" میں موجود ہے وہ بھی اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

ہیچ می دانی کہ صورت بندِ ہستی بافرانس ۔۔۔ فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

روس را سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود | قہرِ او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد | جرمنی را چشمِ حیران و دلِ بیتاب داد
تا برانگیزد نوائے حریت از سازِ دہر | صدرِ جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خوردِ فطرت از جنابِ او ببرد
بہرِ ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

خلافت اور ترک و عرب

اقبالؔ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے "معارف" کے لیے نظم طلب کی تھی۔ اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ جو فارسی نظمیں لکھی گئیں، ان میں سے ایک "معارف" کو بھیج دی گئی، دوسری جامعہ ملیہ علی گڑھ کے رسالے "جامعہ" کو اور تیسری "علی گڑھ منتھلی" کو۔ اور کوئی نظم لکھی نہیں۔ مولانا گرامی کی ایک غزل کا شعر بہت پسند آیا۔ اس کی تضمین میں نے کی تھی۔

"پیامِ مشرق" میں اس واسطے اس کو داخل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو ہمیں اشاعت میں کوئی عذر نہیں"۔

"معارف" نے اس پر لکھا:

یہ سچ ہے کہ "پیامِ مشرق" کے ساز میں یہ لحنِ شیرازی کچھ زیادہ سامعہ نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبالؔ کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے۔

سخنے راندہ کہ جز قرشی | بر سرِ مسندِ نبیؐ نہ نشست
درس گیر از گرامیِ ہمہ درد | کہ برید از خود و بہ او پیوست

رمزِ ترک و خلافتِ عربی　　گفت آں مے گسارِ بزمِ الست
"ماہ را بر فلک دو نیم کنند
فقر را ترکمانی ہم ہست"

حالی اور اقبال

ایک مرتبہ خواجہ حالی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تشریف لائے۔ نظم پڑھنے کا وقت آیا۔ خواجہ صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی آواز مجمع میں نہ پہنچ سکتی تھی، اس لیے اقبال سے درخواست کی گئی کہ ان کی نظم سنا دیں۔ اقبال نے نظم سنانے سے پیشتر فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی　　معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

قطعہ

جس سال اقبالؔ "شمع اور شاعر" انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں پڑھنے والے تھے، بعض اکابر نے اِس شرط پر صدارت قبول کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ اقبالؔ ان کی صدارت میں نظم پڑھیں، مرزا سلطان احمد صاحب اور فقیر افتخار الدین کے درمیان خاص کشمکش تھی۔ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو انجمن نے دونوں کی صدارت یکے بعد دیگرے رکھی اور قرار پایا کہ "شمع اور شاعر" نصف ایک کی صدارت میں پڑھی جائے اور نصف دوسرے کی صدارت میں۔ اقبالؔ نے نظم پڑھنے سے پیشتر مندرجۂ ذیل قطعے میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سلطان سے مراد مرزا سلطان احمد اور فقیر سے مراد فقیر افتخار الدین ہیں۔

ہم نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت
اے کلام تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہر جائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہم نشیں معذور می دارم ترا
در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر
من کہ شمعِ عشق را در بزمِ دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

دُعا

دردِ گردہ کے زمانے میں ایک مرتبہ یہ دعائیہ شعر کہے تھے جو صرف روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوئے تھے۔

دِہ مرا فرصتِ ہوحق دو سہ روزے دگرے
کہ دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند　　جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست
حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد
ورنہ مارا بہ جہانِ تو سر و کار کجاست

جلیانوالہ باغ امرتسر

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ　　غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم　　تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اِس نہال سے

ترجمہ از ڈائک

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا　　اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا
نیکی ہو ہر اک فعل میں نیت کی ہویدا　　ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہِ افلاک نہیں ہے
یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

("مخزن")

مقامِ خود شناس

احتسابِ خویش کُن از خود مرو | یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو
تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس | اندریں کشور مقامِ خود شناس

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند
بر مگوں شاخِ آشیانِ خود مبند

حبِّ رُوح الذّہب

اقبالؔ ایک مرتبہ دردِ گردہ سے دیر تک تکلیف میں رہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مشورے سے لقمان الملک حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا (برادرِ اکبر ڈاکٹر انصاری) سے رجوع کیا۔ ان کے علاج سے دردِ گردہ کو بھی فائدہ ہُوا اور حکیم صاحب نے عام صحت کے لیے بھی بہت مؤثر دوائیں تجویز فرمائیں، جن میں سے "رُوح الذہب" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ذیل کے قطعہ میں اسی "رُوح الذہب" کی تاثیر کا اعتراف کیا گیا ہے :۔

ہے دو رُوحوں کا نشیمن پیکرِ خاکی مرا | رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوقِ طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبحِ ازل | دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی رُوح الذہب

"اقبالؔ" کا جواب

تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں جناب محمد حسین صاحب عرشیؔ امرت سری نے ایک نظم میں براہِ راست اقبالؔ سے خطاب کیا تھا کہ آپ کیوں خاموش ہیں۔ اس کے جواب میں یہ شعر کہے گئے تھے اور "زمیندار" میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اردو میں عرشیؔ اور اقبالؔ کی نظموں پر محاکمہ لکھتے ہوئے "حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است" کی تضمین کی تھی۔

عرشیؔ گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار

آہے درونہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست
دارم ہنوز از کرمِ ساقیِ حجاز

آں لالہ کہ موجِ نسیمے دلش نخست
از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز

پیرِ عجم چہ گفت بہ رندانِ مے پرست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردشِ شراب

"دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و درِ گفتگو بہ بست"[1]

مکافاتِ عمل

دہر میں نوش کا جواب ہے نیش
ہر عمل کے لیے ہے ردِّ عمل

---

[1] "زمیندار" ۲۲۔ مئی ۱۹۲۰ء

شیر سے آسماں لیتا ہے انتقامِ غزالِ و اشتر و میش
سر گزشتِ جہاں کا سرِّ خفی کہ گیا ہے کوئی نکو اندیش
"شمع پروانہ را بسوخت و لے
زود بریاں شود بہ روغنِ خویش"

قطعہ

وفاداراں سہ قسم اند اربدانی[1] زبانی اند و نانی اند و جانی

---

[1] "زبانی" سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکومت کی خوشامد میں لمبی چوڑی تقریریں کرتے تھے۔ فرماتے ہیں اُن کی خدمات کا موزوں معاوضہ خطابات ہیں۔ "نانی" سے مراد وہ لوگ ہیں جو حصولِ معاش کے لیے خوشامد میں سرگرم تھے۔ ان کے لیے موزوں معاوضہ یہ ہے کہ کسی نہری آبادی میں زمین دے دی جائے البتہ اگر وہ ملاقات کرنا چاہیں تو جواب دے دیا جائے۔ باقی رہے "جانی وفادار" تو اعتماد کے اصل اہل وہی ہیں اس لیے کہ وہ ضرورت کے وقت جان بھی دے دیتے ہیں "زبانی" اور "جانی" کے متعلق فارسی زبان کے اشعار میں لطائف موجود ہیں لیکن علامہ مرحوم نے ان میں "نانی" کا اضافہ کر کے ایک دلچسپ لطیفہ پیدا کر لیا جو محض لطیفہ ہی نہیں بلکہ وقت کے وابستگان حکومت کے طور طریق اور مقاصد کی صحیح تصویر بھی ہے اور خاص طور پر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ "وفاداران جانی" حکومت کو میسر نہ تھے عموماً "زبانی" اور "نانی" ہی میسر تھے۔ اِسی لیے فرمایا:۔

وفاداران جانی را بہ دست آر

یعنی ایسے وفاداروں کی بہم رسانی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ یہ بھی واضح رہے کہ فارسی اشعار میں "یاران زبانی و جانی" کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن علامہ اقبالؔ نے زیرِ نظر اشعار میں "یاراں" کی بجائے "وفاداران" کو موضوعِ سخن قرار دے کر لطافت کا ایک اور پہلو پیش کیا ہے۔

زبانی راز منصب عزتے دہ ‏ ‏ زبینے برسرِ نہرے بہ نانی
اگر باغی بخواند دیگراں را ‏ ‏ ببایدداستاں ازوے برانی
اگر ذوقِ ملاقاتے تو دارد ‏ ‏ جوابش دہ بحرفِ لن ترانی
وفادارانِ جانی را بدست آر ‏ ‏ اگر خواہی زجانی جانستانی

(۱۹۱۵ء)

بنائے قومیّت

انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ عموماً تین روز رہتا تھا اور ہر روز تین تین چار چار اجلاس ہوتے تھے علامہ اقبالؔ نے اپنی مشہور نظم "شمع اور شاعر" ستائیسویں سالانہ اجلاس کے دوسرے دن ۱۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو تیسرے اجلاس میں بعد عصر پڑھی تھی، جس کے صدر فقیر افتخارالدین صاحب مہتمم بندوبست تھے۔ اس سے پیشتر دوسرے اجلاس میں حضرت علامہ مرحوم نے متفرق کلام سنایا تھا جس کے صدر مرزا سلطان احمد تھے۔ مثلاً

۱۔ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

۲۔ ہم نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت

ان دونوں نظموں سے پہلے مندرجۂ ذیل رباعی پڑھی تھی، جس کے متعلق خود آپ نے فرمایا:
رباعی کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعلق وطن سے کیا ہے۔[۱]

تو قیس نہیں تو تجھ کو بَن سے کیا کام ‏ ‏ زر پاس نہیں تو راہزن سے کیا کام
مسلم کی بنائے قومیت ہے اسلام ‏ ‏ مسلم ہے اگر تو تو وطن سے کیا کام

---

[۱] انجمن حمایت اسلام کے ستائیسویں سالانہ جلسے کی روداد صفحہ ۵۷، ۵۸

خطاب بہ شریف حرم

با مرغِ حرم از منِ دل سوختہ فرما
اے آنکہ بہ صحرا نفس آزاد بر آری
"جویاے گلستانی واز طالعِ گمراہ
ترسم کہ سر از خانۂ صیاد بر آری"[1]

بہر نذرِ آستانت از عجم آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیماے من[2]

تا بروید لالۂ آتش نژاد از خاکِ شام
باز سیرِ اطلس ز خونناب مسلماں کردہ اند[3]

---

[1] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۳۱ ۔ دوسرا شعر کسی ایرانی شاعر کا ہے ۔

[2] "پیامِ مشرق" میں یہ شعر یوں ہے :

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیماے من

[3] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۳۴ ۔

متفرق اشعار

چناں زدست دوئی شست لوحِ خاطرِ خویش　　　کہ وحشتی تو ہم از آہوے خیال رمید [1]

گلِ تبسم کہ رہا تھا زندگانی کو مگر　　　شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں [2]

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ　　　الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا [3]

ضبط از دلِ من بردو فرو ریخت بجانم　　　آں نکتہ کہ با مومن و کافر نتواں گفت [4]

برق را ایں بہ جگر می زند، آں رام کند　　　عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است [5]

تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ نہ　　　باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّا ے من [6]

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۴۶۔ [2] صفحہ ۵۱۔ [3] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۹۔ یہ اکبر الہ آبادی کو لنگڑا پہنچنے کی رسید ہے
[4] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۱۶۔ [5] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۲۰۔ [6] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۳۲۔ یہ شعر نعت میں ہے۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی میں گل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمع بزمِ اہلِ ملّت را چراغِ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن[1]

(۹۔ جون ۱۹۰۸ء)

ترسم کہ تو مے رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر

برکشت و خیابان پیچ، برکوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر

ایں صوت دل آویزے از زخمہ مطرب نیست
مہجورِ جہاں حورے نالد بہ رباب اندر

در دولت کدۂ عطیہ بیگم
بمبئی ۱ستمبر ۱۹۳۱ء
محمد اقبال

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ زاں غنچہ کہ بادِ سحر او را نکشود[2]

---

[1] خطوط بنام بیگم فیضی ۔ یہ اشعار اقبالؔ نے بیگم جنجیرہ کے لیے تحریر فرمائے تھے ۔

[2] بیگم مسعود کے مُردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ بیگم کے والد ماجد کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر لکھ بھیجا۔

نشہ از حال بگیریم و گزشتیم ز قال — نکتۂ فلسفہ در دتہِ جام است ایں جا
اے کہ تو پاسِ غلط کردۂ خود مے داری — آنچہ پیش تو سکون است خرام است ایں جا
ما دریں رہ نفسِ دہر بر انداختہ ایم — آفتاب سحر او لب بام است ایں جا[1]

مجھے صیاد تہِ دام پھڑک جانے دے — میں نہ گلشن میں رہوں گا تو مرے پر ہی سہی
شعر اقبالؔ کو آتا نہیں کہنا لیکن — آپ کہتے ہیں سخن ور تو سخن ور ہی سہی

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھیے — میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

بہ صحن گلشن ما صورتِ بہار بیا — کشادہ دیدۂ گل بہر انتظار بیا

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں — خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں[2]

تماشائے دل گن بہنگام شام — دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر — زند غوطہ در آبِ دل آفتاب[2]

---

[1] مکاتیب اقبال صفحہ ۱۰۰ شائع کردہ بزم اقبال [2] برائے لوح مزار سر راس مسعود۔

زلفِ درازِ حُسن پہ یوں طعنہ زن ہوئی
تیری طرح سے ہم نہ رہیں گے حجاب میں
اچھا ہُوا یہیں سے نکیرین چپ ہوے
کچھ بات بڑھ چلی تھی سوال و جواب میں
آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں سنوار تو
تیری بلا سے کوئی رہے پیچ و تاب میں

("نشتر" بابت دسمبر ۱۹۰۶ء)

ایں سرِ خلیل است با آذر نتواں گفت

مکاتیبِ اقبال کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے یہ مصرع خان نیاز الدین خاں کو لکھا تھا کہ اس پر مصرع لگانا چاہیے۔ (مکاتیبِ اقبال ص۱۶)

معلوم نہ ہو سکا کہ کسی اَور نے مصرع لگایا یا نہ لگایا لیکن مولانا گرامی کے دیوان میں یہ شعر یوں مرقوم ہے:

ایں امرِ جلیل است ابوجہل چہ فہمد
ایں سرِ خلیل است بہ آذر نتواں گفت

نظر بہ ظاہر مولانا گرامی نے ڈاکٹر صاحب کے مصرع پہ مصرع لگا کر اپنی غزل میں شامل کر لیا۔

مجھے اقبال اُس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

در جہاں مانند جوے کوہسار
از نشیب و ہم فراز آگاہ شو
یا مثالِ سیل بے زنہار خیز
فارغ از پست و بلند راہ شو

("اقبال نامہ" حصّہ دوم ص۵)

قطعاتِ تاریخ

نیات تعلقہ

والدِ ماجد کے انتقال کی تاریخ

یہ قطعۂ تاریخ اقبال نے اپنے والد ماجد کی لوحِ مزار پر کندہ کرا دیا تھا:

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت — ما ہمہ راہرواں، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخِ رحیل — آمد آواز "اثرِ رحمت" و "آغوشِ لحد"[1]
۱۳۴۹ھ — ۱۳۴۹ھ

ذوالفقار گنج، لدھیانہ (ملکیت نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم)

بانیِ ایں خوش بنا سرِ ذوالفقار — سالِ تعمیرش ز ہاتف خواستند
از فلک تاریخ چوں شبنم چکید — بر زمیں خُلدِ بریں آراستند
۱۹۲۱ء

---

[1] یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ اقبال کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۳۳۳ھ میں ہوا تھا۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے زیرِ عنوان اقبال نے جو نظم کہی، وہ "بانگِ درا" میں چھپ چکی ہے۔ اس جیسا مرثیہ کسی دوسری زبان میں شاید ہی مل سکے۔ والدہ ماجدہ کی لوحِ مزار پر سید اکبر الہ آبادی کا کہا ہوا قطعہ ثبت کرا دیا تھا جو ذیل میں درج ہے:

مادرِ مخدومہ اقبال رفت — سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم — "رحلتِ مخدومہ" تاریخِ وفات
۱۳۳۳ھ

بر وفات جسٹس شاہ دین ہمایوںؔ :

دوش بر خاکِ ہمایوں بُلبُلے نالید و گفت
اندریں ویرانہ ما ہم آشنائے داشتیم

منشی محمد دین فوقؔ کے کلام کی تاریخ :

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار — معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نظرِ فوقؔ
شستہ ہے زباں، جملہ مضامین ہیں عالی — تعریف کے قابل ہے خیالِ نظرِ فوقؔ

تاریخ کی مجھ کو جو تمنّا ہوئی اقبالؔ
ہاتف نے کہا لکھ دے "کمالِ نظرِ فوق"

"شالامار باغ" از فوقؔ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۱ء :

حُسنِ سعیِ فوق را صد مرحبا
ہست ہر سطرِ کتابش دلربا
از سرِ نازش پئے تاریخِ او
مے سزد تصویرِ باغِ جانفزا[۱]

۱۹۰۱ء

---

[۱] "تصویرِ باغِ جانفزا" سے ۱۸۵۱ نکلتے ہیں۔ ان میں سرِ نازش یعنی "ن" کے پچاس جمع کیے جائیں تو سنہ ۱۹۰۱ ہو جاتے ہیں۔

سرسید۔ تاریخِ وفات ۲۸۔ مارچ ۱۸۹۸ء

انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک

۱۳۱۵ھ

یہ تاریخ خواجہ حالی نے "یادگار" میں بلا تصریح نام شائع کی تھی۔ منشی وجاہت حسین جھنجھانوی نے "سرسید کا ماتم" کے نام سے ایک مرقع چھاپا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔
یہ تاریخ "منشی محمد اقبال صاحب طالب علم گورنمنٹ کالج لاہور تلمیذ حضرت "داغ" کی ہے

امیر مینائی ــــ:

تاریخ وفات ۱۷۔ نومبر ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ)

لسان صدق فی الآخرین

داغ ــــ: تاریخ وفات ۲۹۔ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء)

نواب میرزا داغ

۱۳۲۲ھ

یہ مادہ متعدد اصحاب کو سوجھا۔ حیرت شاہ جہان پوری نے اسے یوں نظم کیا تھا:

کیا شانِ کرم ہے دیکھ حیرت — بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو گہر، فلک کو انجم — جنّت کو "نواب میرزا داغ"

ظہیر دہلوی

۱۹- مارچ سنہ ۱۹۱۱ء (سنہ ۱۳۲۹ھ)

زبدۂ عالم ظہیرِ دہلوی

جسٹس میاں شاہ دین ہمایوںؔ

۲- جولائی سنہ ۱۹۱۸ء (سنہ ۱۳۳۶ھ)

(۱) چو سالِ فوت ہمایوںؔ دلِ حزیں مے جُست
زہشت خلد ندا ایم رسید "المومن"

"المومن" کے اعداد کو آٹھ سے ضرب دی جائے تو سنہ ۱۳۳۶ ہوتے ہیں[1]

(۲) در گُلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوے گل رمید
مے جُست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت
"علامۂ فصیح" زہر چار سو شنید

علامۂ فصیح کے اعداد کو چار سے ضرب دینی چاہیے[2]

---

[1] "المومن" کے اعداد ۱۶۷ ہیں۔ انھیں آٹھ سے ضرب دیں تو سنہ ۱۳۳۶ بن جائیں گے۔
[2] "علامہ فصیح" کے اعداد ۳۳۴ ہیں۔ انھیں چار سے ضرب دیں تو سنہ ۱۳۳۶ بن جائیں گے۔

ڈاکٹر براؤن مشہور مستشرق

(سنہ ۱۹۲۶ء)

نازشِ اہلِ کمال ای، جی، براؤن — فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک — از فراقِ او دلِ مشرق دو نیم
تا بہ فردوسِ بریں ماویٰ گرفت
گفت ہاتف ذالکَ الفوز العظیم

۱۹۲۶ء

اہلیہ کی تاریخِ وفات

۲ - اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء (سنہ ۱۳۴۲ھ)

اے دریغا از مرگِ ہم سفرے — دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم — سخنِ پاکِ مصطفیٰ[1] آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بہ شہادت رسید و منزل کرد

---

[1] سخنِ پاکِ مصطفیٰؐ میں اشارہ ہے "المبطون شہید" کی طرف۔ چونکہ اہلیہ کا انتقال زچگی میں ہوا تھا، اس لیے حدیثِ پاک کی طرف اشارہ کیا۔

منشی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار"

(سنہ ۱۳۵۱ھ)

سحر گاہاں بہ گورستاں رسیدم
درآں گورے پُر از انوار دیدم
زہاتف سال تاریخش شنیدم
معلّیٰ تربتِ محبوبِ عالم

۱۳۵۱ھ

مہاراجا کِشن پرشاد کے صدرِ اعظم ہونے پر

صدرِ اعظم گشت شادِ نکتہ سنج
ناوکِ او دشمناں را سینہ سُفت
سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں
جانِ سلطاں سر کشن پرشاد گفت

۱۳۴۰ھ

تاریخ وفات شیخ عبدالحق

چوں مئے جامِ شہادت شیخ عبدالحق چشید
باد بر خاکِ مزارش رحمتِ پروردگار

باعزیزاں داغِ فرقت داد در عینِ شباب
آستیں ہا از دُرِ اشکِ غمش سرمایہ دار

بندۂ حق بود ہم خدمت گزارِ قومِ خویش
سالِ تاریخِ وفات او زغفراں آشکار

۱۳۳۱ھ

تاریخِ فتح سمرنا

شاخِ ابراہیم رانم مصطفیٰؐ
مہدیِ آخر زماں ہم مصطفیٰؐ

گوش کن اے بے خبر تاریخِ فتح
گفت اقبالؔ: اسمِ اعظم مصطفیٰؐ

۱۳۴۲ھ

تاریخ وفات والدۂ جاوید

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید — لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبال نے تاریخ کہی سرمۂ مازاغ[1]

۱۳۵۴

تاریخ وفات نواب وقار الملک

نواب وقار ملک و ملت — افشاند سوئے جناں رکابش
بر لوح مزار او نوشتم — انجام بخیر با خطابش

"وقار الملک انجام بخیر"

۱۳۳۵

تاریخ وفات سلطان اسمٰعیل جان

از جہاں شہزادہ اسمٰعیل رفت — آں امیر ابن امیر، ابن امیر
از فلک آمد بگوشش من ندا — سال آں مغفور از مغفور گیر[2]

تاریخ مسجد داتا گنج بخش

سال بنائے حرم مومناں — خواہ از جبریل و ز ہاتف مجو
چشم بہ "المسجد الاقصیٰ" فگن — "الذی بارکنا" ھم بگو

۱۳ / ۱۳۵۰

---

[1] تاریخ وفات ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء۔ [2] چوک شاہ ابو المعالی میں سرِراہ ایک قدیم چار دیواری کے اندر ایوب شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ ان میں ایک قبر سلطان اسمٰعیل جان کی ہے جس کے تعویذ پر یہ قطعہ درج ہے۔ (مآثر لاہور جلد دوم از منشی محمد دین فوق)

رُباعیات

یہ رباعیاں اقبال نے اُس زمانے میں کہی تھیں، جب بی۔اے میں پڑھتے تھے اور یہ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۱ء کے "کشمیری گزٹ" میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ سب کشمیر اور اہلِ کشمیر کے متعلق ہیں۔

(۱)

کہکشاں میں آ کے اختر مِل گئے — اِک لڑی میں آ کے گوہر مِل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے — ہم وطن غربت میں آ کر مِل گئے

(۲)

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھُٹ سکا — شکوۂ حکام پر اے دل نہیں تیرا عجب
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا — پائے گُل اندر چمن دائم بُراست از خارہا

(۳)

موتی عدن سے، لعل ہُوا ہے یمن سے دُور — با نافۂ غزال ہُوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بُلبُل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

(۴)

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر — چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کی صدف میں پنہاں — مِل کے دُنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

(۵)

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے | جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلّی گہِ مولائے جلیل | عرشِ دو کشمیر کے اعداد برابر نکلے

(۶)

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا | بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے | رُوحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا

(۷)

بت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے | یادِ ایّامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبالؔ | کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

(۸)

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے | اُس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدمؑ کی جائیداد | جو ہے وطن ہمارا وہ جنّت نظیر ہے

مزاحیات

ان مختلف مزاحی نظموں میں سے بعض اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔ اقبالؔ نے "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت انھیں قلم انداز کر دیا:

(۱)

اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری — ہم کو نہیں ہے مذہبِ اسلام سے عناد
لیکن وہ ظلم ننگ ہے تہذیب کے لیے — کرتے ہیں ارمنوں پہ جو ترکانِ بد نہاد
مسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ — مِٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد
سُن کر یہ بات خوب کہا شہنواز[1] نے
بلّی چوہے کو دیتی ہے پیغامِ اتّحاد

(۲)

بختِ مسلم کی شبِ تار سے ڈرتی ہے سحر — تیرگی میں ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح
ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود — بن کے شمس العلما چمکے ہیں جگنو کی طرح

(۳)

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ! — دل گراں، ہمت سبک، وہ ٹر فرداں، ارزی تنگ

---

[1] غالباً میاں شاہ نواز کی طرف اشارہ ہے جو اقبالؔ کے خاص دوست تھے۔

بے ٹکٹ بے پاس بھارت کی سیاسی ریل میں — ہو گیا آخر مسیتا بھی مع اسباب بُک
"لک وِدِن" کا حکم تھا اِس بندۂ اللہ کو — اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے "مسلم اوٹ لک"[1]
کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار — کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا "کُک"[2]
ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگِ سخن — ہر سخن ور کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اِک اَور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دِلّی کے زباں دانوں نے ٹُک

(۴)

عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے — نہیں اس کمیٹی کا کوئی اجنڈا
تمھیں ہند سرمایہ دار و مبارک — سلامت رہے مجھ کو فیجی یوگنڈا[3]

میں ڈنڈے پہ شاکر تو انڈے پہ راضی
مرا پیر ڈنڈا ترا پیر انڈا

---

[1] انگریزی کے روزنامہ "مسلم اوٹ لک" کی طرف اشارہ ہے جو مولوی عبدالحق مالک مطبع رفیق عام نے جاری کیا تھا اور داؤد اسپن اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ [2] باورچی، آیا سے مراد صاحب کے بچوں کو کھلانے والی ملازمہ۔ [3] فیجی بحرالکاہل کا جزیرہ جہاں ہندوستانی مزدوری کے لیے چلے گئے تھے اب وہاں ان کی خاصی آبادی ہے۔ یوگنڈا مشرقی افریقہ کی انگریزی نوآبادی ہے۔ وہاں بھی ہندوستان کے لوگ بہ سلسلہ کاروبار بہ کثرت پہنچے۔

(۵)

پٹی خوب جمن کے ہاتھوں نصیبن گئی عرس میں اور شب بھر نہ آئی
نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ اس کو پڑی روپ بسکٹ کا دھارے خطائی[1]
خدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی
کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

(۶)

جناب شیخ کو بلواؤ خاص لندن کی عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لیے
ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لیے
ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لیے؟

---

[1] خطائی اپنے حسن کی کتنی ہی آرائش کر لے لیکن بسکٹ کی جگہ نہیں لے سکتی اور صاحب کی میز تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۷)

یہ قطعہ اقبالؔ نے عطیہ بیگم فیضی کو ایک خط میں لکھا تھا۔ عطیہ بیگم کے نام اقبالؔ کے خطوط شائع ہوئے تو یہ قطعہ بھی چھپا:

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن، گئی
تاجِ شاہی یعنی کلکتہ سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی[1]

(۸)

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی — کمزور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفتِ برگِ گل نہیں — لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا اِدھر ہے زیبِ بدن اور زرہ اُدھر — صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض ہو بھلا

---

[1] یہ قطعہ غالباً ۱۹۱۲ء کا ہے۔ بنگال کو لارڈ کرزن نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس پر بنگالیوں میں سخت ناراضی پھیلی، یہاں تک کہ دہشت انگیزی شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم تاج پوشی کے لیے دہلی آئے تو ان کے اعلانوں میں سے دو بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں: اوّل: تقسیمِ بنگال کی تنسیخ دوم: کلکتہ کے بجائے دہلی کو دارالحکومت بنانا۔ تقسیمِ بنگال کی تنسیخ سے بنگالیوں کا مطالبہ پورا ہو گیا۔ گویا انھیں دھوتی مل گئی لیکن دارالحکومت چھن گیا۔ اس طرح پگڑی ان سے چھین لی گئی۔

پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں ۔۔۔ دانہ جو آسیا سے ہُوا قوّت آزما
بولا یہ بات سُن کے کمالِ وقار سے ۔۔۔ وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا

خارا حریف سعیِ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست دربُنِ دنداں خلال را

(۹)

کہی اچھّی نقیبِ انجمن نے ۔۔۔ وہ سمجھے گا اسے جو کارداں ہے
خدا واحد ہے، دو ناظم ہیں اپنے ۔۔۔ دوعملی میں ہمارا آشیاں ہے[1]

(۱۰)

اتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی ۔۔۔ دیکھیے ہوتے ہیں کب سرمالوی
مسلمِ ناداں کو کیا معلوم ہے ۔۔۔ کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن ۔۔۔ کب ہیں گاندھی کے برابر مالوی

مردِ میداں گاندھیِ درویش خو
اور کونسل کے سپیکر مالوی

---

[1] اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کے سکرٹری ایک کے بجائے دو مقرّر ہوے تھے۔ ایک حاجی میر شمس الدین مرحوم، دوسرے شیخ عبدالعزیز مرحوم۔ یہ دراصل انجمن میں فریق بازی کی ایک صورت تھی، جسے عام مسلمان اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھی بڑے محتاط انداز میں اس صورتِ حال پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

(۱۱)

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانے میں — ملّا کا، محتسب کا، خدا کا، نبی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانے میں — مضمون نگار بیوی کا، سی آئی ڈی کا ڈر

(۱۲)

انساں ہوئے مہذب لیکن مزہ تو جب ہے
جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتنی
تقریر کو کھڑی ہو کلّو میاں کی بیوی
پردھان ہو سبھا کی بنبی کی دھرم پتنی

یہ کفر سے آزاد وہ اسلام سے آزاد
مندر میں نہ بدری ہے نہ مسجد میں مسیتا

"بانگِ درا"

مندر سے تو آزاد تھا پہلے ہی سے "بدری" — مسجد سے نکلتا نہیں ضدی "ہے مسیتا"

مسلمانوں کی جمعیّت اگر کم ہے تو کیا پروا

مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے بیان فرمایا کہ ۲۱۔ جولائی ۱۹۱۱ء کی شب کو وہ علامہ اقبال مرحوم کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ کاسہ لیسانِ ازلی کا ذکر چھڑ گیا اور دہلی دربار کی تصویر بھی سامنے آ گئی۔ چنانچہ مولانا اور علامہ نے مشترکہ طور پر ایک نظم ترتیب دی، جو ذیل میں درج ہے۔ اس کے پہلے دو شعروں میں پشتینی وفاداروں کے عقیدہ و ارادت کی طرف اشارہ ہے، باقی شعروں میں مختلف واقعات پر کنایے ہیں۔ آدھے شعر مولانا کے ہیں اور آدھے علامہ اقبال کی فکرِ سلیم کا نتیجہ ہیں:

---

۱ ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے — کہ اس کی ذات پر نازاں بساطِ کہنہ و نَو ہے
۲ اگر اس کی غلامی کے لیے نواب جھکتے ہیں — تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لَو ہے
۳ کئی مسلک کیے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا — احمد شہ کا کوئی بھٹو، کوئی آغا کا پیرو ہے
۴ عجب ہے کھیل قسمت کا کہ چپسی الکشن کی — بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی پَو ہے
۵ حصولِ جاہ و عزت جس وفاداری کا مقصد ہو — وہ جنسِ ناروا گندم نہیں، گندم نما جَو ہے
۶ نہیں ہے بہرِ اظہارِ وفا لازم نمود اصلا — کہ بحرِ شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رَو ہے
۷ ملے گی تشنۂ عزت کو کب اعزاز کی قفلی — مہینا جون کا ہے اور یہ سرگرمِ تگ و دَو ہے
۸ مبارک ہے یہ جشنِ تاجپوشی جس کے صدقے میں — وہ مسجد تک چلا آیا کلب گھر کا جو رہرو ہے
۹ مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا — عدد سَو کے چھیاسٹھ ہوں مگر مفہوم تو سَو ہے
۱۰ نہیں ہوتے ہیں لیڈر ان میں پیدا قابلیت سے — مسلمانوں میں یہ مخلوق مثلِ سبزہ خودرَو ہے

خوشامد نے جلا ڈالا ہے خودداری کے خرمن کو ۱۱ ذرا سی شمع ہے کم بخت اور کتنی بڑی لو ہے

ضرورت کچھ نہ کچھ دنیا میں ہے عصمت فروشوں کی ۱۲ یہ روحانی قدمچہ ہے، یہ اخلاقی بدرو ہے

پرانی روشنی میں دیکھ لو ہے پختگی کیسی!

۱۳ کہ پہلے دن سے مہر و ماہ میں قائم وہی ضو ہے[1]

---

[1] "چٹان" لاہور کا اقبال نمبر (۲۵- اپریل سنہ ۱۹۴۹ء)

قیاس کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان میں مولانا کے شعر کون کون سے ہیں اور علامہ کے کون کون سے لیکن دونوں کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بڑی حد تک وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نمبر ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳ علامہ مرحوم کے معلوم ہوتے ہیں اور باقی مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے۔ یہ اشعار اگرچہ ارتجالاً کہے گئے جیسا کہ ان کے انداز سے واضح ہے، تاہم بطور تبرک انھیں شائع کیا جاتا ہے اور انھیں محفوظ کر دینے کی بھی یہ ایک اچھی صورت ہے

ضمیمہ

بعض اشعار کتاب کے چھپ جانے کے بعد دستیاب ہوے وہ تمام بہ طور
ضمیمہ درج کیے جاتے ہیں

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

دم آفرینش ہدایت تھی دل کو
کلیم تماشاے ہر طور رہنا

سکھائی ہے کس نے تمھیں بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

دکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مجھے دور رہنا

نبھائیں گے کیا ایک سے وہ محبّت
جنھیں ہر نظر میں ہو منظور رہنا

نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے
اسیر خم گیسوے حور رہنا

کوئی چال اس خاکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا

نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورت نور رہنا

نہ ہو جن کی آنکھوں میں تاب نظارہ
بھلا ان غریبوں سے کیا دور رہنا

وہ سو ناز اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا

۱۹۰۱ء میں منشی محمد الدین فوق نے ہفتہ وار اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو

اقبال نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا ؎

"پنجہ فولاد" اک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے

دفتر اخبار ہے لاہور میں
جس کا کوچہ کوچہ کوئے یار ہے

ہے روش اس کی پسند خاص و عام
واہ وا کیا معتدل اخبار ہے

غیر سے نفرت نہ اپنوں سے بگاڑ
اپنے بیگانے کا ہر دم یار ہے

سطر سطر اس کی مفید ملک و قوم
کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے

دید کے قابل نہ ہو کیوں "بزمِ فوق"
شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے

"ضامن صحت" کا ایسا ہے عمل
وہ ضمانت کے لیے تیار ہے

ہے "تجارت" کا بھی کالم کیا مفید
یوسف معنی کا یہ بازار ہے

وہ "لطائف" ہیں کہ پڑھتے ہی جنھیں
لوٹنے میں دِل کبوتر وار ہے

کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے
جب ایڈیٹر ناظم و نثار ہے

"سٹلمنٹ آفس" کا بھی ہے بندوبست
شاہد ان دعووں کا خود اخبار ہے

ہے مدلل رائے اس اخبار کی
ہے وہ کافر جس کو کچھ انکار ہے

رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی
منصفوں کو اس کا آپ اقرار ہے

جتنے ہیں ہمعصر دیکھیں غور سے
فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے

تین رائج سکے قیمت سال کی　　اس سے سستا اور کون اخبار ہے
اور پھر انعام میں ناول ہیں مفت　　واہ کیا سودا ہے کیا بیوپار ہے
آٹھویں دن حاضری لے لیجیے　　تابع فرمان خدمت گار ہے
سیر اس گلشن کی کر کے دیکھیے　　ایک گلشن رشک صد گلزار ہے
رنگ آزادی ہے ہر مضمون میں　　سرو ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے
کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر　　بات یہ بھی قابل اظہار ہے
لیجیے مجھ سے جواب مختصر　　یہ معمّا کچھ نہیں دشوار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوقؔ　　عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے
شوق ہے مضموں نویسی کا اُسے　　طبع گویا ابر گوہر بار ہے

گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے
آدمی ہشیار واقف کار ہے[1]

---

[1] "بزمِ فوق"۔ "خامۂ صحت"۔ "تجارت"۔ "مذاقِ سخن"۔ "مشاہیر"۔ "لطائف"۔ "سٹلمنٹ آفس" وغیرہ اس اخبار کے مستقل کالم تھے۔ اقبال کا بہت سا ابتدائی کلام اس اخبار میں چھپا۔

تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہوگا
کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا

تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے کوئی دن میں تمہارا ہوگا

حشر میں کچھ تو تمھیں حسن پہ ہوگی امید
کچھ مرا شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا

گھر میں بیٹھے ہیں خدا لکھے کہ باہر ہیں کہیں
نامہ بر یہ بھی کسی نے تجھے پوچھا ہوگا

نامہ بر کام تو باتوں میں بنا کرتے ہیں
مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقا ہوگا

ہاں سنا پہلے ہمیں ان کو کہے گا کیا کیا
نامہ بر ہم جو بتائیں وہی کہنا ہوگا

ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں لیکن
دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گزرنا ہوگا

تیرے اشعار میں اقبال یہ رنگت تو نہ تھی
تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا

ٹھہرتا ذرا، سن کے کمبخت آتا
وہاں نامہ بر! آج تکرار کیا تھی

میرا دل بھی اٹھنے کو چاہا نہ واں سے
فسوں تھا کوئی بزم اغیار کیا تھی

یہ وعدہ کسی نے کیا کیا سمجھ کر
مری بزم تھی بزم اغیار کیا تھی

چھپائی ہے زاہد کوئی چیز تو نے
یہ شئے تیرے قرباں مرے یار کیا تھی

تیرے ساتھ اڑتی گئی راہ گزر میں
مری خاک اے دامنِ یار کیا تھی

قفس میں ہے بلبل تو ویراں چمن ہے
یہی رونقِ رنگِ گلزار کیا تھی

سلیقہ نہ تھا بات کرنے کا تم کو
مجھے یاد ہے میری سرکار کیا تھی

محاصرۂ ادرنہ[1]

اس نام سے جو نظم "بانگِ درا" (صفحہ ۲۴۲) پر شائع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا نام "اسلامی رواداری" تھا اور اس میں سے مندرجہ ذیل اشعار نظرِ ثانی کے وقت حذف کر دیے گئے تھے۔

تھا امتیاز کچھ نہ ہلال و صلیب میں
مقصود فوج خانۂ معمور ہو گیا

اقبال اس پیمبرِ امیؐ کے ہیں فدا
ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا

دنیا میں جس کی مشعلِ خلقِ عظیم سے
ہر ذرّہ شرحِ سورۂ والنور ہو گیا

اُمّت کا جس نبیؐ کی حروفِ جلی میں نام
قرطاسِ روزگار پہ مسطور ہو گیا

مرہون پیچ و تاب وہ اُمّت ہے اب تو کیا
کیا غم جو اس کا دن شبِ دیجور ہو گیا

دنیا میں پیچ و تاب ہے شرطِ ثمر کہ تاک
کھا کھا کے پیچ صاحبِ انگور ہو گیا

شائع شدہ نظم میں ایک مصرع اب یوں ہے

آخر امیرِ عسکرِ ترکی کے حکم سے

یہ مصرع ابتدا میں یوں تھا:

آخر امیرِ فوجِ حجازی کے حکم سے

---

[1] ادرنہ یا ایڈریا نوپل میں ترکی فوج کا سپہ سالار شکری پاشا تھا۔

(۱)

اس زمین کی غزل بانگِ درا (ص۱۴۸) پر شائع ہو چکی ہے، نظرِ ثانی میں اس کے مندرجہ ذیل اشعار حذف کر دیے گئے:

ہوا جہاں میں ہے پرکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر مقام کرتے ہیں

رہینِ لذّتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرر
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے دل کو،
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں[1]،

(ماخوذ از دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء)

---

(۲)

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنّت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا

۱؎ مہاراجا سرکشن پرشاد شادؔ جو اس زمانے میں فرمانروائے دولتِ آصفیہ کے وزیرِ اعظم تھے۔

آنکھ میں ہے جوشِ اشک اور سینے میں سوزاں ہے دل
یاں سمندر رکھ دیا اور واں سمندر رکھ دیا

بے یقین پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وہ صنم
غیر کے گھر آج میں نے اپنا بستر رکھ دیا

بعد مُردن بھی نہ ڈالا بار کچھ احباب پر
قبر میں میرا صبا نے جسمِ لاغر رکھ دیا

نقش پائے غیر دیکھے ہیں جو کوئے یار میں
رہگزر میں مَیں نے خارِ جسمِ لاغر رکھ دیا

آمدِ خط سے ہوا پوشیدہ کب چاہِ ذقن
خضر نے اِک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا

ہنس کے پوچھا اس صنم نے کون ہے تیرا رقیب
میں نے اس کے سامنے آئینہ لے کر رکھ دیا

کشتۂ رخسار کا ظاہر نشاں ہو اس لیے
قبر پر اس نے ہماری سنگِ مرمر رکھ دیا

خانۂ دل دے دیا ہے داغِ الفت کے عوض
رہن میں نے اک درم پر آج یہ گھر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تو نے گر اس کو اٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا

ہاتھ دھو بیٹھے آبِ حیواں سے خدا جانے کہاں
خضر نے اس کو چھپا کر اے سکندر رکھ دیا

قصۂ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دل
ہاتھ میں قاصد کے ہیں نے ایک دفتر رکھ دیا

(رسالہ "زبان" دہلی ۱۸۹۴ء)

(۳)

نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ
اسی کے ہجر میں گویا اداس تھا سبزہ

ہوا کی نم سے ہوئی نرم سرو کی ٹہنی
جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جھک گئی ٹہنی

ہلا رہی ہے سرِ شاخِ گل کو موجِ ہوا
بنا ہے باغ میں بلبل کے واسطے جھولا

نشیمنوں سے نکل کر پرند گاتے ہیں
ہوا سے کھیلتے پھرتے ہیں چہچہاتے ہیں

اتر کے آ گئے وادی میں اَبر کے ٹکڑے
دیا ہوا سے پریشاں ہیں روئی کے گالے

مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا
جو دیکھتا ہوں خرامِ سکون نما اُن کا

کھڑے ہیں محفلِ قدرت کو دیکھنے والے
کسان کھیتوں سے اٹھ اٹھ کے جھونپڑوں کو چلے

جفاکشی کا خضر کہیے ان کسانوں کو
یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو[1]

(زمانہ جون ۱۹۰۵ء)

(۴)

دہر کی شان تھا خطّۂ کشمیر میں دیکھ — باغ جنت کی ہوا خطّۂ کشمیر میں دیکھ
ذرّے ذرّے میں ہے اک حسن کا طوفان بپا — جوش میں لطفِ خدا خطّۂ کشمیر میں دیکھ

(۵)

چشمِ آدم آں سوئے افلاک نورش ہم نہ یافت
از خیالِ مہر و مہ اندیشہ گرد آلودہ بود

---

[1] بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار اسی نظم کا ایک حصہ ہیں جو بانگ درا میں "ابر" کے زیر عنوان ص ۹۲ پر شائع ہوئی ہے۔

من درونِ سینۂ خود سومناتے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسودہ بود

(۶)

ہر کہ بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت
تربت او را زمینِ جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسیدہ خاکِ او را بوسہ داد
گفتمش سال وفاتِ او بگو، "مغفور" گفت[1]

۱۳۲۶ھ

(۷)

گر اے شبِ سیہ تجھے حسرت ہے نام کی
کچھ قرض مانگ لے مرے بختِ سیاہ سے[2]

---

[1] مراد پیر سید حیدر شاہ ساکن جلال پور شریف ضلع جہلم ہیں، جن کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہُوا اور اپنے زمانے کے مشہور اولیا میں سے تھے۔ [2] اقبال کے ایک ہم وطن میراں بخش صاحب جلوہؔ سیالکوٹی تھے، جو عرضی نویسی کرتے تھے، شعر بھی کہتے تھے اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر بہ طورِ تفنّن ان کے لیے کہا تھا اور جلوہ صاحب کا رنگ خاصا سیاہ تھا جس کی وجہ سے شعر ان پر خوب چسپاں ہُوا۔

اسرار و رموز

"اسرارِ خودی" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا اور یہ ایڈیشن شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کے زیرِ اہتمام چھپا تھا جو حضرت علامہ کے عزیز دوست تھے اور انھیں طب کے علاوہ فنِ کتابت میں بھی کمال حاصل تھا۔ منشی عبدالمجید "پروین رقم" حکیم صاحب ہی کے شاگرد تھے اور "پروین رقم" خطاب بھی حکیم صاحب ہی کا تجویز فرمایا ہوا تھا۔ "رموزِ بے خودی" بھی پہلی مرتبہ حکیم صاحب ہی کے اہتمام میں چھپی تھی۔ پھر "اسرار" کا دوسرا ایڈیشن بالکل "رموز" کی وضع کا شیخ مبارک علی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ بعد ازاں حضرت علامہ مرحوم نے دونوں مثنویوں کو "اسرار و رموز" کے نام سے یکجا کر کے "پیامِ مشرق" وغیرہ کی تقطیع پر چھپوا دیا۔

"اسرار" کے پہلے ایڈیشن میں بھی خاصی ترمیمات ہوئی تھیں جن کا ذکر حضرت علامہ نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں فرما دیا تھا۔ ان دونوں مثنویوں کے جن نسخوں میں آخری مرتبہ اصلاحات یا اضافے کیے تھے، وہ بطور تبرک شیخ مبارک علی کے پاس محفوظ ہیں۔ "اسرار" کے پہلے ایڈیشن میں جو ترمیمیں ہوئی تھیں ان کے متعلق بعض یادداشتیں میرے پاس موجود تھیں، ان سب کو ملا کر یہ مرقع تیار کیا گیا ہے اور اپنی نوعیت میں یہ بالکل یگانہ ہے، اس لیے کہ مثنویوں میں حذف، اضافے یا ترمیم کا ایسا مرقع اب تک تیار نہیں کیا جا سکا، بلکہ اس مرقعے میں وہ اشعار بھی لے لیے گئے ہیں، جو حضرت علامہ نے پہلے لکھے، پھر خود ہی کسی وجہ سے غیر موزوں سمجھ کر کاٹ دیے۔

میں نے ترمیم یا اضافے کے لیے "اسرار و رموز" کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔ میرے پاس "رموز" کے پہلے ایڈیشن کے علاوہ "اسرار" کے دونوں ایڈیشن بھی موجود ہیں۔ ان کے صفحات کا حوالہ بھی دیا جا سکتا تھا، تاہم یہ ایڈیشن بہت کم اصحاب کے پاس موجود ہوں گے، اس لیے حوالے محض تکلف ہوتے۔ ہر صفحے کے اشعار کے متعلق حاشیے میں بتا دیا ہے کہ ترمیم دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت یا تیسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت ہوئی۔

اسرارِ خودی

صفحہ	ابتدائی شکل	ترمیم شدہ شکل
۵	بے نیاز از گوشِ امروز آمدم من صدائے شاعرِ فردا استم	نغمہ ام از زخمہ بے پروا استم من نوائے شاعرِ فردا استم
۱۰	حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام	حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام در رگِ مہ گردشِ خوں دیدہ ام
۱۲	خیزد، انگیزد، فتد، تابد، دمد سوزد، افروزد، خرامد، پر زند	خیزد، انگیزد، فتد، تابد، دمد[1] سوزد، افروزد، کشد، میرد، رمد
۱۴	گرچہ پیکر مے پذیرد جامِ مے جنبش از ما وام گیرد جامِ مے	گرچہ پیکر مے پذیرد جامِ مے گردش از ما وام گیرد جامِ مے[2]
	کوہ چوں از خود رود صحرا شود شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود	کوہ چوں از خود رود، صحرا شود شکوہ سنجِ یورشِ دریا شود[3]
۱۵	سبزہ چوں تابِ نمو از خویش یافت ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت	سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت[4]

---

[1] تینوں شعر تیسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت بدلے گئے [2] دوسرے ایڈیشن کے وقت، [3] تیسرے ایڈیشن کے وقت، [4] دوسرے ایڈیشن کے وقت۔

۱۶۔	آرزو را در دلِ خود زندہ دار
. . . .	تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار
. . . .	آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
. . . .	فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست ۱؎
۱۷۔ نے گرفت از نیستاں آئینِ خویش!	نے برون از نیستاں آباد شد
نغمہ زد از لذتِ تعیینِ خویش!	نغمہ از زندانِ او آزاد شد ۲؎
چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم!	چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم
چیست رازِ اختراعاتِ علوم!	چیست رازِ تازگیہائے علوم ۳؎
۱۸۔ بینی و دست و دماغ و چشم و گوش	دست و دندان و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش	فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش ۴؎
۱۸۔ عاشقانِ او ز خوباں خوب تر	عاشقانِ او ز خوباں خوب تر
از حسینانِ جہاں محبوب تر	خوشتر و زیباتر و محبوب تر
۲۱۔ چوں نبیؐ دختر چہ را بے پردہ دید	دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید	چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
۲۲۔ در تپیدِ متصل آرام من!	در تپیدِ دم بہ دم آرام من
گرم تر از صبحِ محشر شامِ من	گرم تر از صبحِ محشر شامِ من

۱؎ یہ شعر دوسرے اڈیشن کے وقت تازہ کہے گئے، پہلے میں یہ موجود نہ تھے۔ ۲؎ دوسرے اڈیشن کے وقت نہ تھے
۳؎ دوسرے اڈیشن کے وقت۔ ۴؎ تیسرے اڈیشن کے وقت۔

۴۵- راکب و سامان و محمل مے برد	مست زیر بار محمل مے رود
پائے کوبان سوئے منزل مے برد	پائے کوبان سوئے منزل مے رود
۵۱- طبع فطرت عمرہا در خوں تپید	طبع مضمون بند فطرت خوں شود
تا دو بیت ذات او موزوں شود	تا دو بیت ذات او موزوں شود[1]
۵۲- از وجود تو سرافرازیم ما!	از وجود تو سرافرازیم ما
پس بہ آلام جہاں سازیم ما	پس بہ سوز ایں جہاں سازیم ما
۵۳- فکر گردوں رس زمیں پیما ازو	فکر گردوں رس زمیں پیما ازو
دیدہ اعمیٰ، گوش ناشنوا ازو	چشم کور و گوش ناشنوا ازو
″ در جہاں ہر فتح از کراری است	مرد کشور گیر از کراری است
آبروئے مرد از خودداری است	گوہرش را آبرو خودداری است
۵۴- در عمل مخفی است مضمون حیات	در عمل پوشیدہ مضمون حیات
ذوق تخلیق است قانون حیات	لذت تخلیق قانون حیات
۵۶- مدعی گر صاحب قوت بود	مدعی گر مایہ دار قوت است
دعویش مستغنی از حجت بود	دعوی او بے نیاز از حجت است[2]

۱؎ تیسرے ایڈیشن کے وقت۔

۲؎ دوسرے ایڈیشن کے وقت۔

۲۴- جملہ انتقام تو از ناداری است	خستگی ہائے تو از ناداری است
اصل علّت ہا ہمیں بیماری است	اصل دردِ تو ہمیں بیماری است
۲۷- رفت آں درویش سر افگندہ پیش	رفت آں درویش سر افگندہ پیش
غرق اندر قلزم افکارِ خویش	غوطہ زن اندر یم افکار خویش[1]
۳۰- شیرہا از بیشۂ سر بر زدند	شیرہا از بیشہ سر بیروں زدند
بر حصارِ گوسفنداں تاختند	بر علف زارِ بزاں شبخوں زدند[2]
۳۱- نیست ممکن کز کمالِ وعظ و پند	نیست ممکن کز کمالِ وعظ و پند
رنگ سبعیت پذیرد گوسفند	خوے گرمی آفریند گوسفند
۳۲- ذرہ شو، صحرا مشو گر عاقلی	ذرہ شو، صحرا مشو گر عاقلی
تا ز فیضِ نیّرے تاباں شوی	تا ز نورِ آفتابے بر خوری[3]
۳۳- قومِ شیراں فتحِ پیہم خستہ بود	خیلِ شیراز سخت کوشی خستہ بود
دل بہ ذوقِ استراحت بستہ بود	دل بہ ذوقِ تن پرستی بستہ بود
″ آمدش ایں وعظ خواب آور پسند	آمدش ایں پند خواب آور پسند
گشت محو از کلامِ گوسفند	خورد از خامی فسونِ گوسفند[4]
۳۴- راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم	راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم	از گروہِ گوسفندانِ قدیم

[1] چاروں ترمیمیں دوسرے اڈیشن کے وقت ہوئیں۔ [2] تیسرے اڈیشن کے وقت۔ [3] دونوں ترمیمیں دوسرے اڈیشن میں ہوئیں۔ [4] دوسرے اڈیشن کے وقت۔

۵۸- داستانے از کمالش سر کنم
قلزمے در قطرۂ مضمر کنم

۶۵- در بنارس برہمنے محترم
غوطہ خوار قلزم بود و عدم

۶۷- کوہ چوں ایں طعنہ از دریا شنید
صد شرار از سینۂ خارا پرید

۶۹- از تو قلزم سائل طوفاں شود
شکوہ سنجِ تنگیِ داماں شود

۷۵- حرف ملا شمس را حدت فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود

۸۱- . . . .
. . . .

۸۷- . . . .
. . . .

۸۷- . . . .
. . . .

داستانے از کمالش سر کنم
گلشنے در غنچۂ مضمر کنم

در بنارس برہمنے محترم
سر فرو اندر یم بود و عدم

کوہ چوں ایں طعنہ از دریا شنید
ہم چو بحرِ آتش از کیں بر دمید

از تو قلزم گدیۂ طوفاں کند
شکوہ ہا از تنگیِ داماں کند

سوز شمس از گفتۂ ملا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر

کوہ آتش خیز کن ایں کان را
ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

باز مارا برہماں خدمت گزار
کار خود با عاشقاں خود سپار

۸۸ آفتاب از فیضِ او گردوں مقام
برقہا محوِ طوافِ او مدام

۸۹۔ من مثالِ لالۂ صحرا استم
در ہجومِ عالمے تنہا استم

آفتاب از سوزِ او گردوں مقام
برقہا اندر طوافِ او مدام
من مثالِ لالۂ صحرا استم
درمیانِ محفلے تنہا استم[1]

---

[1] یہاں اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ ص۷۵ والے شعر کے سوا تمام اشعار کی اصلاح یا تازہ اشعار کا اضافہ دُوسرے ایڈیشن کے وقت ہو چکا تھا۔

حذف شدہ اشعار

"اسرارِ خودی" میں سے بعض اشعار حذف بھی فرما دیے جن کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ "حکایت طائرے کہ از تشنگی بے تاب بود" "اسرار و رموز" کے صفحہ ۶۰ سے شروع ہو کر صـ ۶۲ پر ختم ہوتی ہے۔ آخر سے دو شعر چھوڑ کر یہ چار شعر تھے جو حذف کر دیے:

صورتِ منصور گر خود بیں شوی — ہم چو حق بالاتر از آئیں شوی
سوزِ مضمون دفترِ منصور سوخت — جلوہ رقصید و قماع طور سوخت
رفت از تن روحِ گردوں تازِ او — از اجل بیگانہ مانند آوازِ او
نعرۂ اش در لب چو گویائی نہ دید — سر بروں از قطرۂ خونش چکید

۲۔ پھر "حکایت الماس و زغال" میں صـ ۶۴ پر نیچے سے دو شعر چھوڑ کر حجر اسود کے متعلق ایک اور شعر تھا، جو حذف کر دیا۔

پختگیہا جست و خود آگاہ شد — زینتِ پہلوے بیت اللہ شد

رموزِ بے خودی

ابتدائی شکل	ترمیم شدہ شکل
۹۳- اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد	اے ترا حق خاتم اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایام کرد	بر تو ہر آغاز را انجام کرد[1]
″ اے بہ عشق دیگراں دل باختہ	اے نظر بر حسن ترسازادۂ
جلوہ ہائے خویش را نشناختہ[1]	اے ز راہ کعبہ دور افتادۂ[2]
۹۵- ز آسمانِ آبگوں یم می چکد	ز آسمانِ آبگوں یم می چکد
بر گلِ صبحم چو شبنم می چکد	بر دلِ گرمم دمادم می چکد
۹۶- تا ز خاکت لالہ زارے بر دمد	تا ز خاکت لالہ زار آید پدید
نغمہ ہائے خفتہ سر بیروں زند	از دمِ بادِ بہار آید پدید
۹۸- فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند	فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسر اند	سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند[3]
۱۰۲- تا خدا صاحبدلے پیدا کند	تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کز فغانے نغمۂ انشا کند	کو ز حرفے دفترے املا کند

---

[1] یہ پہلے پیشکش والے باب کا تیسرا شعر تھا۔ اب وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ [2] یہ پہلی ترتیب میں پیشکش والے باب کا چھٹا شعر تھا۔ اب اسے تیسرا بنا دیا گیا ہے۔ [3] آخری مصرعے کی ایک صورت یہ بھی تجویز کی تھی۔ "سفتہ در یک رشتہ مثل گوہر اند" پھر اسے کاٹ کر دوسرا مصرع لکھا گیا۔

۱۰۶- لاالہ سرمایۂ اسرار ما	لاالہ سرمایۂ اسرارِ ما !
پردہ بند از شعلۂ افکار ما	رشتہ اش شیرازۂ افکار ما ،
۱۰۹- چُوں کلیمے سوے فرعونے رود	چوں کلیمے سوے فرعونے رود
قلب خویش از لاتخف محکم کند	قلبِ او از لاتخف محکم شود
. . . .	جانم از مظلومیِ او می تپید
. . . .	اشکِ خوں از دیدۂ دل می چکد[1]
۱۱۳- شاہ رمز آگاہ شد محوِ نماز	. . . .
خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز[2]	. . . .
۱۱۴- نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت	شیر بر آمد پدید از طرفِ دشت
دشت و در از ہیبتش لرزندہ گشت	از خروشِ او فلک لرزندہ گشت[3]
۱۱۸- مسلم از مینائے حق صہبا کشد	دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
نعرۂ لا قوم بعدی می زند	نعرۂ لا قوم بعدی می زند
۱۲۳- آتش سوزندہ از چشمش چکید	. . . .
دستِ آں بیچارہ از خنجر برید[4]	. . . .
۱۳۵- غنچۂ از دستِ گلچیں خُوں شود	غنچۂ از دستِ گلچیں خُوں شد
رختِ ہستی از چمن بیروں کشد	از چمن مانندِ بو بیروں رود

۱؎ ایک مقام پر یہ شعر لکھا تھا، پھر قلمزد کر دیا۔ ۲؎ آخری مصرعے کو بدل کر پہلے یوں بنایا "قلب او بے خود شد اندر بحرِ راز" پھر اسے کاٹ کر پہلی صُورت برقرار رکھی۔ ۳؎ پہلے دوسرا مصرعہ یوں بنایا تھا: "دشت و دراز نعرہ اش لرزندہ گشت" پھر مرقومہ مصرعہ لکھا۔ ۴؎ اس کا پہلا مصرعہ بدلا تھا۔ پھر اُسے کاٹ دیا اور اصل بحال رکھا۔

۱۴۰- نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے	نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے
چوں پریشاں شد صدا غوغاستے	ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے
۱۴۷- روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر	روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
از خیالِ صلح گردد بے خطر	بر گمانِ صلح گردد بے خطر
۱۴۸- پائے تا در وادیِ بطحا گرفت	پائے تا در وادیِ بطحا گرفت
تربیت از حدتِ صحرا گرفت	تربیت از گرمیِ صحرا گرفت
۱۵۳- حدتے پیدا کن اندر خونِ خویش	کوکبی؟ می تاب بر گردونِ خویش
پا منہ بیرون ز پیرامونِ خویش	پا منہ بیروں ز پیرامونِ خویش[1]
۱۵۵- تا نماید تاب نامشہود خویش	تا نماید تاب نامشہودِ خویش
شعلۂ او جامہ باف از دودِ خویش	شعلۂ او پردہ بند از دودِ خویش
۱۵۵- آتشِ او دم بجوشش اندر کشد	آتشِ او دم بجوشش اندر کشید
لالۂ گردد ز شاخے بردمد	لالہ گردید از شاخے بردمید
۱۶۰- قیس اگر آوارہ در صحراستے	قیس اگر آوارہ در صحراستے
از خیالِ محملِ لیلاستے	مدعایش محملِ لیلاستے
۱۶۱- ایں کہن پیکر کہ عالم نامِ اوست	ایں کہن پیکر کہ عالم نامِ اوست
امتزاجِ امہاتِ اندامِ اوست	ز امتزاجِ امہاتِ اندامِ اوست

---

[1] پہلے مصرعِ اول یوں لکھا: آتشے پیدا کن اندر خونِ خویش۔ پھر اسے کاٹ کر یوں بنایا: تاب و تب پیدا کن اندر خونِ خویش۔ بالآخر بصورتِ موجودہ رکھا۔

۱۶۵۔ حق جہاں را ورثۂ نیکاں شمرد	حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد	جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
۱۶۷۔ تا قوی از حکمتِ اشیا شود	تا نصیب از حکمتِ اشیا برد
ناتواں باج از توانایاں خورد	ناتواں باج از توانایاں خورد
۱۶۹۔ سیلئے از دستِ مادر می خورد	. . . .
خویشتن را باز در مادر تند	. . . .
مزد روشستن ز مادر گیرد او	. . . .
چوں گل از بادِ سحر زر گیرد او	. . . .
چشم او ہر لحظہ بر اشیا فتد	. . . .
از لبش ہر دم سوالے می چکد [۱]	. . . .
۱۸۴۔ ہیچ میدانی کہ ہارون الرشید	قائدِ اسلامیاں ہاروں رشید
آنکہ نقفور آب تیغ او چشید	آنکہ نقفور آب تیغ او چشید
تا باغش زنگ خویش انداخت است	. . . .
احمرت را غیر اصفر ساخت است [۲]	. . . .

۱۔ یہ تین اشعار اس باب میں تھے جس کا عنوان ہے "کمال حیات ملیہ این است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند"۔ ان میں سے پہلے دو کا نمبر ابتدا سے پانچواں اور چھٹا تھا، تیسرے کا آٹھواں۔ یہ تینوں نظر ثانی میں حذف کر دیے ملاحظہ ہو 'اسرار و رموز' کا صفحہ ۱۶۹۔

۲۔ یہ شعر ۱۸۶ پر 'بے نیازی زنگ حق پوشیدن است' کے بعد تھا اور حذف کر دیا گیا۔ نیز چند اشعار کی ترتیب بھی بدلی گئی۔

۱۸۶۔ از خزانش خاک تو خاموش گشت	از نشیمن خاک تو خاموش گشت
وز گل و ریحاں تہی آغوش گشت	وز گل و ریحاں تہی آغوش گشت
۱۹۸۔ مسلمے از ما سوا بیگانۂ	مسلمے از ما سوا بیگانۂ
تا کجا زنجیریِ بُت خانۂ	تا کجا زنّاریِ بُت خانہ

اضافے

بعض اضافے بھی کیے۔ مثلاً یہ شعر:

در جہاں مثلِ حباب اے ہوشمند — راہِ خلوت خانہ بر اغیار بند

اسے پہلے یوں لکھا تھا:

تا نیفتد بر حبابِ تو شکست — بر ہمہ باید رہِ کاشانہ بست

ایک مقام پر ایک شعر یوں لکھا:

خاکِ عشق افشار من آئینہ ریخت — در گلویم نغمۂ دیرینہ ریخت

پھر اسے قلمزد کر دیا۔
